

۶۴۵

گلشن

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰

M. Ahmed Ali Khan

New Print Agent,

810 ROAD, HYDERABAD-50

تصانیف نیاز فمچوری

مذہبی استفسارات و جوابات
کا

مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فرست یہ ہے۔ صحاب کف معجزہ و کرامت۔ انسان مجبور یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ حضرت کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور مارون۔ حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا۔ توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ باروت۔ عوف کوثر۔ امام ۶ مدی۔ نور محمدی اور یل صراط آتش سرود وغیرہ۔ صفحہ ۶۴۴۔ قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے والی
انجیل انسانیت

من ویزداں

مولانا نیاز فمچوری کی ۴۴ سالہ دور تصنیف صحافت کا ایک نیا کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کی برتری و انبوت عامہ کے ایک رستے والہ بنانے کی دعوت دی گئی ہے جس میں مذاہب کی تخلیق و دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پُر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور انشائوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر باول میں منتقل کئے گئے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت

چار روپیہ
علاوہ محصول

جمالستان

ادبی نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان و ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین نمونے کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے
علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشا الطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنہیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

ترغیبات جنبی یا

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے نیا ایڈیشن۔ قیمت چار روپیہ
علاوہ محصول

اس اشاعت کے بعد آپ کو سالنامہ ۱۹۵۲ء ملے گا جو جنوری، فروری ۱۹۵۳ء کے پرچوں پر مشتمل ہوگا۔ سالنامہ کے لئے ۶ کے ٹکٹ رجسٹری کے لئے ضرور روانہ کیجئے اگر آپ کا چندہ دسمبر ۱۹۵۲ء میں ختم نہیں ہوتا

نہایت ضروری اعلان

خریداران "نگار" اور ایجنٹ حضرات توجہ فرمائیں

۱۔ اگر دسمبر ۱۹۵۲ء میں آپ کا چندہ ختم نہیں ہوتا تو سالنامہ ۱۹۵۳ء کے محفوظ پہونچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ آپ چھ آنے کے ٹکٹ رجسٹری کے لئے بھیج دیں۔ ورنہ بصورت دیگر ہم اس کے محفوظ پہونچنے کے ذمہ دار نہ ہوں گے اور دوبارہ آپ اسے مفت نہ حاصل کر سکیں گے۔

۲۔ پاکستان کے جن خریداروں کی میعاد خریداری

ختم ہو چکی ہے یا دسمبر میں ختم ہونے والی ہے، ان کو سالنامہ اس وقت روانہ ہوگا جب وہ سالانہ چندہ آٹھ روپیہ چھ آنے (معہ مصارف رجسٹری سالنامہ) ذیل کے پتوں میں سے کسی پتہ پر ذریعہ رجسٹری بھیج کر رسید ڈاک خانہ براہ راست ہم کو بھیج دیں گے۔ سالنامہ کی روانگی ۱ جنوری ۱۹۵۳ء سے شروع ہو جائے گی، اس سے پہلے ہم کو رسید ڈاک خانہ مل جانی چاہئے۔

۱۔ ڈاکٹر ہاشمی - ۱۹۱۰، الہی بخش کالونی - کراچی

۲۔ اشاعت منزل - بھل روڈ - لاہور

۳۔ ایجنٹ حضرات نوٹ کر لیں

کہ سالنامہ نگار کی قیمت فی کاپی تین روپیہ ہے، لیکن انھیں ۲۵ فی صدی کمیشن دیا جائے گا اور مصارف رجسٹری کے بھی انھیں کے ذمہ ہونگے۔ بچپس کاپیوں اور اس سے زیادہ آرڈر پر کمیشن ۳۳ فی صدی ملے گا۔ لیکن مصارف رجسٹری بھی انھیں کے ذمہ ہوں گے۔ جتنی کاپیاں مطلوب ہوں، اس کی اطلاع ہم کو ابھی مل جانا چاہئے ورنہ ممکن ہے کہ ہم ان کے دوسرے آرڈر کی تعمیل نہ کر سکیں۔

۴۔ ۲۴ پونڈ کے سفید کاغذ کا سالنامہ

چار روپیہ میں ملے گا۔ اور جو خریداران نگار اس اچھے کاغذ کا سالنامہ طلب کریں گے ان کو بھی ایک روپیہ زائد ادا کرنا ہوگا۔

منیجر نگار لکھنؤ

۱۹۵۵ء کا سالنامہ

علماء اسلام نمبر

ایک نہایت اہم تاریخی کارنامہ ہوگا

اس خاص نمبر میں عرب، ایران، اسپین، مصر، ہندوستان وغیرہ کے ان تمام اکابر علم و ادب کا ذکر کیا جائے گا جنہوں نے کسی خاص فن یا شعبہ علم کی نمایاں خدمت انجام دی ہے اور کوئی نہ کوئی تصنیف اپنے بعد چھوڑ گئے۔

اس خاص نمبر میں عہد نبوی سے لیکر عہد حاضر تک کے تمام ماہرین تفسیر و قرآن، ائمہ حدیث، فقہاء، حکماء، اطباء، متکلمین، ماہرین لسانیات و ادب، علماء فلکیات و ریاضیات، طبیعیات و نفسیات، علماء تاریخ جغرافیہ، سوانح نگاروں اور سیاحوں کا ذکر کیا جائے گا۔

اس کے علاوہ

ابتداء میں ایک نہایت بسیط و مفصل مقدمہ ہوگا جس کے پہلے حصہ میں یہ بتایا جائے گا کہ مختلف ملکوں کے حکمران مہاندانوں نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا حصہ لیا اور دوسرے حصہ میں ان تمام علوم و فنون پر تاریخی تبصرہ ہوگا جو مسلمانوں کے عہد میں پروان چڑھے یہ مقدمہ بجائے خود ایک مستقل تصنیف ہوگی۔

ہم کوشش کریں گے کہ اس سالنامہ کی چند کاپیاں دبیر سفید کاغذ پر بھی طبع کرائی جائیں یہ صرف ان حضرات کے لئے مخصوص ہوں گی جو ایک روپیہ زائد دینا پسند فرمائیں گے۔

سالنامہ کی کتابت شروع ہو گئی ہے اور ہم ۲ جنوری ۱۹۵۶ء کو اسے شایع کر دیں گے اس لئے جن حضرات کا چندہ دسمبر ۱۹۵۵ء میں ختم نہیں ہوا وہ ۲۷ آگست ۱۹۵۶ء کے لئے ضرور روانہ فرمائیں ورنہ ہم دوبارہ مفت فراہم نہ کر سکیں گے۔

پاکستان میں نگار اور مطبوعات نگار

ان پتوں سے حاصل کیجئے:-

- ۱۔ کتاب محل۔ کراچی۔ ۲۔ اقبال بک ڈپو۔ کراچی
- ۳۔ ڈاکٹر ہاشمی۔ ۱۹۱۰۔ الہی بخش کالونی کراچی
- ۴۔ ہاشمی برادر س بکسیر کوئٹہ بلوچستان
- ۵۔ مکتبہ جدید لاہور۔

اگر ہاں تک کسی ماہ کا پرچہ آپ کو نہ ملے

تو اطلاع ملنے پر آئندہ ماہ کے پرچہ کے ساتھ ہم اپنے صرف سے فراہم کر دیں گے لیکن اگر آپ اس سے قبل چاہیں گے تو بیرنگ روانہ ہوگا (کیونکہ پہلے کے اندر اندر پیٹ بھیجنے میں ہم کو ۶ گنا محصل ادا کرنا ہوتا ہے) اس لئے جب آپ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع دیں تو یہ ضرور لکھ دیجئے کہ آپ فوراً چاہتے ہیں یا اگلے پرچہ کے ساتھ۔

منجہ نگار

کہ آپ کا چنڈہ دسمبر ۱۹۵۲ء میں ختم ہو گیا اور آئندہ پرچہ
اگر آپ چہندہ منی آرڈر سے روانہ فرمائیے تو
سالنامہ ذریعہ جبرٹی روانہ کیا جائے

نگار

دہلی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس بات کی
ذریعہ دی۔ پہلی آٹھ روپیہ آٹھ آنے میں روانہ ہو گا۔
آٹھ روپیہ چھ آنے بھیجے تاکہ

ادریٹر: نیاز فتحپوری

شمار ۶

فہرست مضامین دسمبر ۱۹۵۲ء

جلد ۶۶

۳۹	صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔۔۔ رشید احمد صدیقی	۳	ملاحظات
۴۱	گاہے گاہے باز خواں (نزارہ دیروحم)	۵	دین الہی کے عناصر اربعہ۔۔۔ محمد عباس طائب مغوی
۴۲	باب الاستفسار۔۔۔	۱۲	نیا دلی ڈائری کے چند اوراق۔۔۔
۴۴	دنیا کی ایک طلسمی گھڑی۔۔۔	۱۸	اکبر الہ آبادی۔۔۔ ڈاکٹر امر ناتھ جیوا
۵۰	منظومات۔۔۔ فضل ابن فضلی۔ اختر تلہری جگر بیلوی۔ شاد مکتبہ جگن ناتھ آزاد۔	۲۲	جہنم۔۔۔ محمد اسحاق (امرتسری)
۵۳	مطبوعات موصولہ۔۔۔	۳۴	فن تحریر کی تاریخ۔۔۔ محمد اسحاق صدی

ملاحظات

بُٹے خوشدلی

دنیا اس وقت اعدائی جنگ سے اس قدر تھک چکی ہے اور امن و سکون کے غیر حقیقی مطالبوں اور ان کے مایوس کن نتائج سے اس دن
بیزار ہو گئی ہے، کہ اگر کسی وقت کسی گوشہ سے واقعی کوئی پُر خلوص آواز آشتی و محبت کی کانوں میں آجاتی ہے تو حیرت ہوتی ہے اور بے اختیار یقین
کر لینے کو جی چاہتا ہے کہ خدا کرے یہ سچ ہو

دنیا نے ہمیشہ جنگ کے ساتھ امن کا خواب دیکھا ہے، زمانہ نے ہمیشہ ہر درندگی کے بعد انسان سے انسان بننے کا مطالبہ کیا ہے اور کبھی
ایسا نہیں ہوا کہ ایک بار ٹھوکر کھانے کے بعد قدرت نے ہمارے اندر پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کا احساس نہ پیدا کیا ہو، لیکن ہمیشہ ہوا یہی کہ لڑائی
لڑی گئی امن کے لئے اور امن کبھی ہاتھ نہ آیا

خیر، اس سے قبل عہد قدیم میں تو یہ تمام جھگڑے ایک محدود حصے زمین میں خاص خاص جماعتوں کے اندر ہوتے تھے اور دنیا کے جس کونے
میں آگ لگتی تھی، اسی کونے تک محدود رہتی تھی، لیکن اب کہ انسان نے زمین کی طنائیں کھینچ کر اسے اپنی ایک مٹھی میں بند کر لیا ہے، اب کہ وقت زمان
مکین و مکان، طول و عرض سب کا مفہوم بدل کر دنیا اس قدر چھوٹی ہو گئی ہے کہ مشرق کے انسان کی سرگوشیاں مغرب کے انسان کے کانوں تک پہنچ
سکتی ہیں، قطب شمالی کا انسان، قطب جنوبی کے انسان سے ہر وقت گفتگو کر سکتا ہے، جنگ و صلح کا مفہوم بھی بالکل بدل گیا ہے اور یہ مکان نہیں کہ

ایشیاء کی پھانسی کی کھٹک مغرب کو یا مغرب کی کڑاہ مشرق کو بے چین نہ کر دے۔ جس وقت پہلی جنگ عظیم ہوئی اس وقت یہ سوال زیادہ اہم نہ تھا اور امن و جنگ کے مسائل زیادہ تر یورپ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن جب دوسری جنگ شروع ہوئی تو ایشیا بھی اس سے کافی متاثر ہوا اور اس کے ختم ہونے پر حالات ایسے بدلے کہ اشتراکیت زیادہ قوت کے ساتھ جمہوریت کے سرائے اٹھ گئی اور آئندہ تصادم کے اندیشہ سے پھر ناخن و چنگال تیز کئے جانے لگے۔

ہندوستان اس وقت تک غلام تھا اور خود اس کی کوئی پالیسی نہ تھی، لیکن جب شہنشاہی میں وہ آزاد ہوا، تو سب سے پہلے اس نے محسوس کیا کہ ایشیاء کی نجات صرف اس پر منحصر ہے کہ خود اپنی راہ الگ متعین کرے اور اس طوفان سے بچنے کے لئے اپنی کشتی علیحدہ طیارہ کرے۔

یقیناً یہ بڑا مشکل اقدام تھا، لیکن نہرو کی شخصیت اور ان کے بے پناہ خلوص و صداقت نے سات سال کے اندر ہی اندر اس خواب کو حقیقت میں تبدیل کر دیا اور حیرت ہوتی ہے کہ وہی روتس جو کل تک ایک سنگین بت کی طرح خاموش رہنے کے سوا کچھ نہ جانتا تھا، آج اس کی گردن کی رگوں میں بھی جنبش محسوس ہو رہی ہے اور امریکہ جو آٹم بم سے نیچے اتر کر کوئی بات کرنا جانتا ہی نہ تھا، آج وہ بھی روتس کے آہنی پردہ کی طرف ہاتھ بڑھانا نظر آتا ہے لیکن ہمارے لئے سب سے زیادہ باعث مسرت پاکستان کی وہ آواز ہے (گو بہت دھیمی تھی) جس سے پتہ چلتا ہے کہ آخر کار وہ بھی "ہندوستان" پاکستان اور افغانستان کے مشترکہ دفاع ہی کو صحیح پالیسی سمجھنے لگا ہے۔

پاکستان میں اس وقت تک متعدد بار سیاسی مہیاں آپکے ہیں اور یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ کیا ہوگا، لیکن اس وقت جو "بوسے خوشدلی" وہاں سے ہندوستان تک پہنچ رہی ہے وہ یقیناً بہت امید افزا ہے۔

کامینہ پاکستان میں جو رد و بدل ہوا ہے وہ ڈکٹیٹر شپ تو نہیں لیکن ایک عسکری انداز کی جمہوریت ضرور ہے اور اسے بھی جلد یا بدیر ختم ہونا ہے لیکن اس کے موجودہ رجحان سے کافی سلامت روی کا اظہار ہوتا ہے۔

امریکہ کی فوجی امداد کے سلسلہ میں مسٹر محمد علی وزیر اعظم کے بعض بیانات نے پاکستان و ہندوستان کے تعلقات کو ناخوشگوار بنادیا تھا اور اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ یہ تنہیاں اور زیادہ ناگوار صورت اختیار نہ کر لیں۔ لیکن انقلاب کامینہ کے بعد وہاں کی خارجی و داخلی سیاست دونوں میں کافی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے اگر یہی ذہنی رفتار قائم رہی تو امید کی جاتی ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے تمام نزاعی مسائل باہمی گفتگو سے سلجھ جائیں گے اور انجمن اقوام کے ہاتھ میں فیصلہ نہ چھوڑا جائے گا جس کا مقصد وہی یہ ہے کہ پاکستان و ہندوستان کے تعلقات خوشگوار نہ ہونے پائیں۔

افغانستان اور پنجتوستان پاکستان و افغانستان کے تعلق کشیدہ ہوتے جا رہے ہیں اور اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ جس طرح تقسیم ہند کے بعد سے پاکستان و افغانستان کے تعلق کشیدہ ہوتے جا رہے ہیں اور اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ جس طرح پاکستان، بھارت سے علیحدہ ہو گیا ہے، اسی طرح افغانستان کا مطالبہ یہ ہے کہ پنجتوستان کو بھی پاکستان سے ایک بالکل جدا وحدت تسلیم کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ پنجتوستان کا علاقہ جو حیرال سے بلوچستان تک چلا گیا ہے اور ۸۰ لاکھ آبادی پر مشتمل ہے، اپنی معاشرت، اپنی زبان اور اقتصاد مزاج کے لحاظ سے، پنجاب و سندھ کی آبادی سے بالکل مختلف ہے اور اس کی ترقی کے لئے مستقلاً ایک جدا گانہ آزاد حکومت کی ضرورت ہے جو صرف اسی کے مفاد کو سامنے رکھے اور دوسرے غیر افغانی علاقوں کے اغراض و مفاد کا بار اس پر نہ پڑے۔ اب رہ گیا یہ مسئلہ کہ وہ آزاد ہونے کے بعد خود اپنی بقا و ترقی کا ضامن ہو سکتا ہے یا نہیں سوا اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ معذرت کے لحاظ سے سارا پنجتوستان بڑی دولت کا مالک ہے۔ تو ہاں جو صنعتی ترقی کی بنیاد ہے، قیر، باجوہ اور ہزارہ کے علاقہ میں بکثرت پایا جاتا ہے، دوسری اہم چیز کوئلہ ہے، سو کوآٹ اور بنوں کا علاقہ اس سے بھرا پڑا ہے، اسی طرح گن جھک سیٹہ، چاندی، سونا، الکڑی وغیرہ کی بھی وہاں کمی نہیں جن سے فائدہ اٹھانے اور یہاں کی آبادی کے صنعتی رجحانات کو بروئے کار لانے کے لئے ایک ایسی حکومت کی ضرورت ہے جس کا نصب العین صرف اسی علاقہ کی اصلاح و ترقی ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اسے پاکستان سے علیحدہ کر کے خود اسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا موقع دیا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر پنجتوستان کا قیام ان دلائل کی بنا پر ضروری ہو تو بھی افغانستان کو اس سے کیا تعلق اور وہ کیوں اس پر زور دے رہا ہے۔

کیا یہی دلائل آج قیام پاکستان کے بعد اس کی طرف سے پیش کئے جا رہے ہیں کل برطانوی حکومت کے زمانہ میں بھی اپنی جگہ اتنے ہی مضبوط اور اٹل نہ تھے، پھر اس وقت افغانستان کی رگ انہوت و حمیت میں کیوں جنبش پیدا ہوئی اور وہ کیوں اپنی قوم کی پامالی کا تماشہ برسر کون کے ساتھ دیکھتا رہا۔

دیں سخن را چہ جواب است تو ہم میدانی

دین الہی کے عناصر اربعہ

(بہ سلسلہ گزشتہ)

(د) عیسائی عنصر۔ عیسوی پادریوں کے خطوط کو ڈاکٹر گٹان وان ریخ والڈ اور دیگر مورخین نے بھی استناداً پیش کیا ہے لیکن ڈاکٹر فونڈسٹم نے جو ”عصر اکبر“ کے سب سے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں تو یہ غضب کیا کہ ان خطوط کے مقابلہ میں دوسری عہری شہادتوں کو اس بُری طرح مسترد کیا کہ خود عیسوی تاریخ کے ماہرین کو اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا پڑی اور ڈاکٹر پین (Payne) اور پروفیسر چودھری نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ڈاکٹر آسمتھ نے ان خطوط کا بالاسنیعاب مطالعہ نہیں کیا۔ حالانکہ اگر خود پروفیسر چودھری ”اکبر دی گریٹ مغل“ کا بالاسنیعاب مطالعہ فرماتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ ڈاکٹر آسمتھ نے اطالوی زبان سے براہ راست ترجمہ بھی کیا ہے۔ اور استناداً لاطینی وغیرہ کی اصل عبارت بھی نقل کی ہے۔ ہاں پروفیسر چودھری کا یہ شکوہ بالکل بجا ہے کہ پروفیسر آسمتھ نے ابوالفضل کو خوشامدی سمجھ کر اس کے بیانات (تسخیر قلعہ اسیر گڑھ وغیرہ کے بارے میں) پر خواہ مخواہ عیسوی پادریوں کے خطوط کو ترجیح دی ہے۔

جیسا کہ میں نے ادراکِ ماقبل میں اشارہ کیا ہے، ہر مذہب کی ایک خاص زبان ہوتی ہے اور ہر زبان کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ڈاکٹر آسمتھ اور پروفیسر چودھری نے اکبر کے مکاتیب کے اسلوب بیان، علامہ ابوالفضل کی طرزِ نگارش اور عیسوی پادریوں کے خطوط کے مرکزی خیال کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ چونکہ یہ عیسوی پادریوں کے اصل خطوط میرے سامنے ہیں اور نہ میں لاطینی یا اطالوی زبان سے واقف ہوں بنا بریں مجھ کو ”اکبر دی گریٹ مغل“ اور ”دین الہی“ کے اقتباسات سے کام لینا پڑے گا۔ ہاں جہاں تک اسلامی نقطہ نگاہ کا تعلق ہے میں اصل آخذ یعنی ”دفاتر ابوالفضل“، ”آئین اکبری“ اور ”منتخب التواریخ“ کو پیش نظر رکھوں گا۔

اکبر کے مکاتیب پر نظر ڈالنے سے قبل سولہویں صدی عیسوی کی بعض اہم خصوصیات کا تذکرہ ہے موقع نہ ہوگا۔ اس صدی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح سولہویں صدی سے تقریباً دو ہزار برس قبل ایک وقت جنابِ موسیٰ حضرت زردشت اور جہاتِ ابرہہ کی تعلیم کا شیعہ ہوا تھا، اسی طرح سولہویں صدی میں مارٹن لوتھر نے پروٹسٹنٹ مذہب کی داغ بیل ڈالی اور شاہ اسماعیل صفوی کی وجہ سے شیعہ مذہب میں فسادِ فتنہ پیدا ہوا، لیکن پانچ سو برس قبل مسیح کے مذاہب کے برعکس سولہویں صدی عیسوی کے حامیان مذہب نے انسانِ محبت کے بجائے زبانِ تیغ کو ذریعہ تبلیغ بنایا کبھی بلجیم اور ہالینڈ میں پروٹسٹنٹوں کا قتل عام ہوا، کبھی فرانس میں ان کے رشتہ منشی پر چھائی گرائی گئی اور کبھی ہنری ثامن کی بڑی لڑائی میری (جو ہنری ثامن کے برعکس نہایت متعصب رومن کیتھولک تھی) نے سیکڑوں پروٹسٹنٹوں کو ذبحِ آتش کیا۔ اسی طرح سلطان سلیم عثمانی نے ایشیا کوچک کے شیعوں کی بڑھتی ہوئی آبادی سے خائف ہو کر ہزار شیعوں میں سے چالیس ہزار شیعوں کو بیک وقت قتل کر دیا اور سنی علماء کا کیا ذکر کہ مکتبِ لک

۱۷۶ دین الہی صفحہ ۱۷۷ — ۱۷۸ حوالہ سابق صفحہ ۱۷۷ — ۱۷۹ دین الہی، تمہید، قوس ۳ — ۱۸۰ اکبر دی گریٹ مغل صفحہ ۱۶۹ ذیل نوٹ نمبر ۱۷۹
صفحہ ۱۷۳ ذیل نوٹ نمبر ۱۷۹ — ۱۸۰ حوالہ سابق صفحہ ۱۷۰ ذیل نوٹ نمبر ۱۷۹ — ۱۸۱ دین الہی، تمہید، قوس ۳ — ۱۸۲
۱۸۳ حسن التواریخ — ۱۸۴ عالم آرائے عباسی وغیرہ میں تو شاہ اسماعیل ثانی کے تبدیل مذہب کا تذکرہ نہیں ہے صرف شاہزادگانِ صفویہ کے قتل کا ذکر ہے مگر ملا
عبدالقادری نے منتخب التواریخ جلد دوم صفحہ ۱۸۳ پر احمدیہ تہ رافضی کے تذکرے میں حسب ذیل الفاظ میں یہ در مقامِ کئے ہیں: — (بقیہ صفحہ ۱۸۳ پر ملاحظہ ہو)

ممالک کے سفیروں نے پروٹسٹنٹ کی طرح شیعوں کو بھی بدعتی سمجھ کر شیعوں کے قتل پر سلطان سلیم کو عادل کا خطاب دیا اور جب شاہ اسماعیل مہدی نے فتح شیراز کے بعد کارزوں کے سنی افاضل و اکابر کا قتل عام کیا تو اس قتل عام کی تاریخ رحمتہ للعالمین (۹۰۹ھ) سے نکالی گئی۔ اسی طرح جلال الدین اکبر کے عہد میں بھی بہت سے ملاحدہ و روافض نکالے گئے۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ سولہویں صدی کے مذہبی دیوانوں کے مقابلہ میں اکبر و اداری کا مجسمہ نظر آتا ہے۔ بے شک اوایل عہد اکبری میں مخدوم الملک اور صدر الصدور کے تعصب کی وجہ سے متعدد شیعہ قتل ہوئے لیکن اکبر اس عہد میں بھی اتنا غیر متعصب تھا کہ اس نے ہم چند ایسے دشمن کو بھی قتل نہیں کیا شیعوں کا کیا ذکر ہے؟ پھر جب آخر عمر میں اکبر کو اپنے معاصرین کے برعکس اپنی وسیع المشرقی کو تنگ نظری کے لباس میں چھپانا پڑا اور جبکہ شاہان صفویہ، سلاطین عثمانیہ اور امرائے اورانہر اپنے مظالم کو سیاسی مصلحت کے پردے میں چھپاتے تھے، اکبر عبداللہ خاں اوزبک کے خط کے جواب میں لاف زہدیت کا التزام دور کرنے کے لئے ان سنم کردوں کا تذکرہ کرتا ہے جن میں صدائے ناقوس کے بجائے آوازِ اذان بلند ہوتی ہے۔ کیا خوب قول ہے ہر فیسردہ دھری کا کہ سولہویں صدی عیسوی کے تعصب زدہ پادری یہ سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے کہ غیر مذہب کا احترام کیونکر کیا جاسکتا ہے اور وسیع المشرقی کیا شے ہے؟ اور یہی وجہ تھی کہ جب اکبر نے اپنی وسیع المشرقی کے تحت شیعوں، ہندوؤں اور پارسیوں کے علماء کی طرح عیسائی پادریوں کا بھی احترام کیا تو ان پادریوں نے یہ رائے قائم فرمائی کہ اکبر عیسائی ہو گیا ہے!

سولہویں صدی کی دوسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس صدی میں یورپ اور ایشیا کے متعدد ممالک میں ایسے جلیل القدر بادشاہ تخت سلطنت پر متمکن ہوئے جو نہ صرف اس صدی میں بلکہ ان ممالک کی پوری تاریخ میں اعظم کے لقب کے مستحق سمجھے گئے مثلاً الیزبتھ اعظم سلیمان اعظم، سلطان ترکی، شاہ عباس اعظم صفوی اور اکبر اعظم اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ان اعظم نے تینے آہدار کے ساتھ ساتھ سیف سیاست کا بھی اتنی کثرت کے ساتھ استعمال کیا کہ ان کی زندگیاں معتمد بن کر رہ گئیں۔ الیزبتھ کے بعض خطوط اور فرامین، برطانیہ کی کتب خانہ میں، سلیمان اعظم کے فرامین و خطوط نقشات سلاطین مولفہ فریدوں نے دیے ہیں۔ شاہ عباس اعظم کے خطوط و فرامین تاریخ عالم آرائے عباسی اور اکبر کے اہم ترین مکاتیب و فرامین، دفاتر ابوالفضل میں موجود ہیں اور جہاں تک عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی کا تعلق ہے آخر الذکر سلاطین ثلاثہ کے مکاتیب و فرامین میں بڑی حد تک یک رنگی نظر آتی ہے لیکن کسی معمولی غرض کے لئے یا محض ناموری کے لئے ایک ہی واقعے کو مسخ کر کے مختلف پہلوؤں سے تحریر کرنے میں اکبر منہر و نظر آتا ہے۔

شاہ عباس اعظم اور اکبر اعظم کے سیاسی تعلقات کی نوعیت عصری تاریخوں کے استقصاء کے باوجود کم از کم میرے لئے ناقابل فہم ہے۔ سلطان محمد فدا بندہ کی وفات کے بعد، نوجوان عباس صفوی اپنے آبائی دشمنوں کی وجہ سے یقیناً سراسیمہ تھا اور اکبر کو اس سراسیمگی کی اطلاع تھی اور اس کے قول کے مطابق ”شوریدہ بختان فرنگ“ کو ”حریم شریفین“ کی راہ سے ”خار و خاشاک“ کی طرح پاک

(الحقیقہ فٹ نوٹ صفحہ ۵) :- ”پدران اور درندہ فاروقی ضیفی المذہب بود ذاکر ناپاک ہر آں نامراداں لعنت می فرستاد و چوں شاہ اسماعیل ثانی در وادی فتن برعکس پدر و ملو نمودہ در مقام قتل وایزائے رافضیاں شد او صحبت میرزا محمد سوم الخ“ اور چونکہ شاہ اسماعیل اول کے لڑکے سام میرزا کا تذکرہ الشعرا جس کا نام تحفہ سامی ہے، اسی اسماعیل ثانی کے عہد میں پایہ اختتام کو پہنچا ہے اور چونکہ تحفہ سامی میں سلاطین عثمانیہ کا ذکر نہایت ادب و احترام سے کیا گیا ہے اور حضرات ائمہ کے اسما و گرامی کے ساتھ علیہم السلام کے بجائے علیہم الرحمہ تحریر کیا گیا ہے لہذا میں ملا عبدالقادر کے قول کو خالی از قوت نہیں سمجھتا۔ یہی تہذیبی مذہب کی غرض تو ممکن ہے کہ اکبر ایم عادل شاہ والی بیجا پور کے قسن یا اس کے لڑکے علی عادل شاہ کے تشیع کی طرح خالصتاً لوجہ اللہ ہو اور ہو سکتا ہے کہ ہنری شتم کے پروفٹسٹنٹ بنیائی کی طرح اسماعیل ثانی کا قسن بھی دنیوی مصلحت پر مبنی ہو۔

۱۔ ”شرکی“ مصنفہ اشیتلین پول صفحہ ۱۵۵ — ۲۔ ”لٹریچر مہتری آن پرشیا“ مصنفہ پروفیسر ڈیورڈ براؤن جلد رابع صفحہ ۵۶-۵۵

۳۔ دفاتر ابوالفضل جلد اول صفحہ ۲۲-۲۲ — ۴۔ ”دین الہی“ صفحہ ۱۴۸

کرنے کی ہم صرف اس وجہ سے متوی کی گئی کہ سلطان روم نے "عہود جد و پدر" کو توڑ کر دلی عراق پر فوج کشی کی اور مسموع ہوا کہ دلی عراق نے طلبہ لک کے لئے ایچی روانہ کیا ہے لہذا "قطع نظر آنکہ از شاہ راہ سنت و جماعت انحراف دارند رعایت خاندان نبوت بر فہمت ہمت بال نرم است علی الخصوص کہ حقوق اسلاف سابقہ در میان باشند" اور اس سلسلے میں عبداللہ خاں اوزبک سے یہ فرمایش بھی کی گئی کہ جب ہم اپنے عزم کے مطابق خراسان کے قریب پہنچ جائیں تو آپ بھی دیدار گرامی سے شاد کام فرمائیں۔ مگر عباس اعظم کو اعانت کے "عزم بالجزم" سے اس وقت تک بے خبر رکھا جب تک اس کے ایچی کی زبانی یہ نہیں سن لیا کہ اب اعانت کی ضرورت نہیں رہی اور عدم اعانت کا عذر گناہ کیا بھی تو اس طرح کہ بدتر از گناہ معلوم ہو یعنی بے ترک اختلال ایران کے زمانے میں "محض پر سیدن شایان آئین مروت و فتوحات نباشد"۔ یہ کہ ہم قندھار حاصل تھی اور چونکہ میرزایان قندھار اس خاندان قدسی کے متبعین میں سے تھے لہذا "فرستادن جیوش منصورہ در نظر عوام کوتاہ ہیں مشتبہ بعدم ارتباط می شد" لیکن اب جب کہ رستم میرزا صفوی کا ورود مسعود ہو چکا ہے اور انھیں صوبہ قندھار سے "بچندین مرتبہ زیادہ" صوبہ لٹان کی صوبہ داری تفویض کی جا چکی ہے اور مظفر حسین میرزا قلعہ دار قندھار "شعبہ عواطف در وابط" سن کر اپنی ماں اور بڑے لڑکے کو ہندوستان بھیج چکے ہیں اور خود بھی احمد ز فر دایں آئے وائے ہیں لہذا ان کے ورود کے بعد عساکر فیروز منر قندھار میں داخل ہوں گے اور قرقہ العین کی ہر طرح کی "امداد و معاضدت" آسانی کی جائے گی۔ یعنی جس طرح ۹۴۱ھ کے بعد شاہ طہماسپ صفوی کے قلعہ دار سے، قندھار باہر کے سرداروں نے واپس لیا تھا اور ۹۵۱ھ میں ہمایوں نے قول و اقرار کو پس پشت ڈال کر ایرانی گورنر براق خاں قاچار سے قلعہ قندھار چھینا تھا (احسن التواریخ مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۳۱۱) اسی طرح رجب سن ۹۵۱ھ میں اکبر نے پورے صوبہ قندھار پر قبضہ کر لیا اور باپ دادا کی روش کے خلاف ندامت آمیز سکوت کے بجائے عصر حاضر کی بعض منفی طاقتوں کی طرح یہ دلیل پیش کی کہ ہماری فوج کی موجودگی تمہاری مدد کے لئے ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ اکبر کے دینی و دنیوی آثار کے ناظم علانی ابوالفضل نے مندرجہ بالا خط کا کاتب ہونے کے باوجود دنیا سازی اور سیاست کی اس ہلکی سی نقاب کو بھی اپنے نجی خطوط میں یہ تحریر فرما کر تار کر دیا ہے کہ "بعد از استماع فتح قندھار کہ مقدمہ فتح ملک ایران است" اور "اگر بفتح قندھار ہم کامروای شادمانی شود شمار انشا ختم باشد امید کہ عنقریب دارالامین شہید را از خس و خاشاک روزگار مصطفیٰ ساختہ بہ نیت تسخیر خراسان و فتح ایران زمین بدست آوردن قندھار را روز اول سفر فتح انجام خود دانست"۔

اکبر کے سیاسی کذب کی لاتعداد مثالیں دفاتر ابوالفضل سے پیش کی جا سکتی ہیں لیکن میرے خیال میں اکبر کے منصوفانہ عقیدے کے

۱۔ دفاتر ابوالفضل جلد اول صفحہ ۲۴-۲۳ — ۲۔ "درینولکہ ایچی فحشہ پیغام رسید معلوم شد کہ آن اختلال روئے در کمی نہاد ہر آئینہ از استماع این خبر خاطر گمراں رہ باطمینان آورد" (دفاتر ابوالفضل جلد اول صفحہ ۲۸) — ۳۔ اکبر نے شاہ طہماسپ صفوی کو ہمایوں کا بھائی سمجھا اور خود کو عباس صفوی کے باپ سلطان محمد خدا بندہ کا بھائی یعنی شاہ عباس اعظم کا چچا تصور کیا اس طرح بزرگ بن کر قرقہ العین کو دیگر سلاطین کے برعکس برادرانہ القاب دینے سے بچ گیا۔ — ۴۔ دفاتر ابوالفضل جلد اول صفحہ ۴۹۔ ڈاکٹر اسمتھ نے "اکبر دی گریٹ مغل" کے صفحہ ۲۵۸ پر صاف صاف لکھا ہے کہ خان خاناں کی سندھ کی ہم قندھار پر حملے کی تمہید تھی مگر اسی اثنا میں صوبہ قندھار کے ایرانی گورنر نے ازبکوں سے خایف ہو کر اور اعزاء کی مخالفت سے تنگ آکر اکبر کو خط لکھا کہ وہ قندھار پر قبضہ کرے اور اکبر نے شاہ بیگ کو بھیج کر قندھار بار دیگر سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا۔ طالب صفوی کہتا ہے کہ عبداللہ خاں اوزبک کے خط میں دلی عراق کی مدد کے لئے اکبر کے عزم خراسان کا تذکرہ حقیقتہً عبداللہ خاں کو قندھار سے باز رکھنے کے لئے تحویف تھی اور بس۔

۵۔ دفاتر ابوالفضل جلد دوم صفحہ ۱۲۹ سطر ۳ — ۶۔ ۵۱۰ سابق صفحہ ۴۴، سطور ۲ لغایت ۴۔ ممکن ہے کہ دفتر اول صفحہ ۱۵۱ اور ۲۴ پر عبداللہ خاں دلی توران کو خراسان کے قریب بلانے اور "دیدار گرامی" سے "شاد کام" کرنے کی فرمایش سے یہ مطلب ہو کہ عبداللہ خاں اوزبک تسخیر ایران میں اکبر کی مدد کرے۔ اس سے قبل جب اکبر نے سلطنت صفویہ کے صوبہ بلوچستان کا نصف حصہ مفتوح کیا تھا تو قرقہ العین کو یہ تحریر کیا تھا کہ :-

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۷ پر بلا غلط فرمائیے)

تحت تمام معروف مذاہب سے یکساں بے نیاز رہنے کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ جب اظہارِ تسنن و اسلام کی ضرورت پیش آئی تو عبداللہ خداں اوزبک کے خط میں سلاطین صفویہ کے ”شاہ راہ سنت و جماعت“ سے انحراف کو مقام طعن میں پیش کیا اور تبلیغ اسلام کی طبع زاد حکایتیں بیان کی گئیں اور جب اظہارِ محبت اہل بیت کو سود مند سمجھا تو کبھی ”طائفہ مقدسہ اہل بیت“ کو ”رازداران اسرار کبریا و پردہ کشایان سررہ انبیاء“ کہا گیا اور کبھی فتح کشمیر کو توفیقات الہی کے ساتھ ”استمداد ارواح طیبہ حضرات ائمہ معصومین سلام اللہ علیہم اجمعین“ پر محمول کیا گیا بالکل اسی طرح جس وقت برتگالیوں سے ربط منبسط بڑھانا منظور ہو تو دیوجرک (Zojer) کے قول کے مطابق پروانہ رگہزاری پر یہ حکم تحریر فرمایا کہ ”جس طرح یسوع مسیح نے آسمان سے زمین پر نازل فرما کر مردوں کو زندگی بخشی اسی طرح میں پادریوں کے مذہب کی برکت سے موت سے نجات پا کر زندگی حاصل کرنے کی امید رکھتا ہوں“ اگرچہ اس عبارت کا وجود کسی عصری تاریخ میں نظر نہیں آتا۔

پادریوں کے خطوط کے مرکزی خیال کا سطحی اندازہ دیوجرک کی مندرجہ بالا عبارت سے ہو سکتا ہے اور صحیح اندازہ ان کے خطوط کے بالائینہ مطالعہ کے بعد کیا جاسکتا ہے۔

ان یسوعی پادریوں کے خطوط کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مبصرانہ و مورخانہ چھان بین کا فقدان نظر آتا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ تبلیغی رپورٹ کی خانہ پری کرنے کے لئے کذب و صیقل کا امتیاز کے بغیر افواہ پر اعتماد کر کے رطب و یابس سب کچھ شامل کر دیا جاتا تھا مثلاً ”اکبر دی گریٹ مغل“ کے صفحہ ۲۶۲ پر (Faher Xaun) کا یہ ارشاد کہ ”بادشاہ محمد سے قطعاً منحرف ہو گیا ہے اور اس کا رجحان ہندو مذہب کی طرف ہے۔ وہ خدا اور مسیح کی پرستش کرتا ہے اور اپنے آپ کو پیغمبر سمجھتا ہے“ یا مثلاً صفحہ ۲۵ پر ایک دوسرے بزرگ کا یہ قول کہ جس طرح دنیا کے نصرانیات میں محمد کے نام کو (معاذ اللہ) نفرت سے دیکھا جاتا ہے اسی طرح دربار اکبری میں بھی وہ نام مبغوض ہے اور شہنشاہ نے صرف ایک بیوی کو رہنے دیا ہے باقی ازواج کو حرم سے نکال کر درباریوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

ان خطوط کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کے لکھنے والے اسلام سے نااہل محض تھے مثلاً ”اکبر دی گریٹ مغل“ کے صفحہ ۲۵ پر مسیحی مبلغ کی یہ رپورٹ کہ ”بادشاہ نے بہت جلد قرآن کو جس کے اوپر جا کر محمد کو پکارا جاتا تھا (معاذ اللہ) برباد کر دیا“ اور خود ڈاکٹر استمداد کوٹ کوٹ غبرگ میں اعتراض کرتا پڑا کہ مبلغ منار سے کو القرآن سمجھا۔ یا مثلاً صفحہ ۷۵ پر (Agha Mirza Asadullah Khan) نے بے ادبانہ غلط بیانی کہ ”محمد کے (معاذ اللہ) مبغوض نام کے علاوہ یہاں کچھ نہیں سنائی دیتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہاں جو کچھ ہیں محمد ہیں۔ یہ لوگ محمد کو

(بقیہ فرٹ نوٹ صفحہ ۷)۔ ”تاریخ بھوجان برہاد و دیگر صحرائینان بہائم بلیعت ثعالب خدایت کہ خاراہ مسافران ایران می شند و نیز بطریق استظاد روئے داد“ (دفتر ابوالفضل جلد اول صفحہ ۲۸) اور عبداللہ خداں اوزبک کو فتح قندھار کی وجہ تحریر فرمائی تھی کہ ”میرزا یان قندھارا برکگاہ والا طلب (داشته حراست آں دیار کہ از قدیم داخل محروسہ است بلا زمان با بری تفویض یافت کہ مبادا جنود توران آں حدود را از منسوبات ایران اندیشیدہ قصد نمایند و غلط عظیم در میان ولایت آں والا شکوہ و ممالک محروسہ واقع شود“ (حوالہ سابق صفحہ ۲-۵) راجہ علی خاں والی خاندیس کے سامنے اس واقعے کو بالکل اور رنگ میں پیش کیا گیا یعنی چونکہ سلاطین صفویہ کے آباد اسلان ظہور دولت کو عنایت صاحب قرانی (تیمور) کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور ہمایوں اور ظہاسپ میں ”روابط“ تھے اور چونکہ شاہ عباس صفوی نے درگاہ معاشی میں ”عرائض اخلاص و ہدایئے گرامی“ بھیجے ہیں ہندوستان کی فتح کا قصد تروہ کیا قندھارا بمیرزا آئے کہ از تنہا بآں دو دمان اند مسلمہ داشتیم“ (حوالہ سابق صفحہ ۷۰)۔

۱۔ دفاتر ابوالفضل جلد اول صفحہ ۲۶ — ۲۔ حوالہ سابق صفحہ ۲۸ — ۳۔ اکبر دی گریٹ مغل صفحہ ۲۵۰ — ۴۔ ”دین الہی“ بحوالہ ڈاکٹر چین۔ پروفیسر جی دھری نے ازمنہ وسطی کے عیسائی مصنفین کی غیر ذمہ دارانہ طرز تحریر کے نمونے کے طور پر تمہید کے صفحہ ۳۲ اور اصل کتاب کے صفحہ ۱۷ پر یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ اس کوڈی گامنے کالی کٹ کے ہندو مندروں کو گرہا اور برہمنوں کو عیسائی راہب سمجھا اور یورپ دو سو برس تک اس کوڈی گام کے بیان کو صحیح سمجھتا رہا۔

سجدے کرتے ہیں۔ محمد کے لئے رکوع کرتے ہیں محمد سے دعا کرتے ہیں اور انھیں کے نام پر خیرات کرتے ہیں یہاں دفعہ دہا شد دشمن مسیح کا راج ہے۔
 ان خطوط کی تیسری خصوصیت ان کا باہمی تضاد ہے، مثلاً "اکبر دی گریٹ مغل" کے صفحات ۱۶۸ لغایت ۱۷۶ پر یسوعی لٹریچر کی
 مرد سے عیسائیوں کے پہلے مشن کا حال بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اکبر کے خط آنے کے بعد گوا سے پادریوں کا مشن ۱۷۵۹ء کو
 روانہ ہو کر ۲۸ فروری ۱۷۵۸ء کو فچیور سیکری پہنچا اور دو بجے رات تک اکبر سے گفتگو ہوتی رہی۔ ۳ مارچ ۱۷۵۸ء کو مقدس بائبل، اکبر کو پیش
 پیش کی گئی اور اکبر نے مقدس بائبل کو بوسہ دیا اور مصوروں کو حکم دیا کہ جناب عیسیٰ اور جناب مریم کی تصویروں کی نقل طیار کریں۔ محل کے اندر
 گرجا بنانے کا حکم بھی ہو گیا اور وہ سالہ شاہزادہ مراد کو پرتگالی زبان اور عیسائی اخلاقیات کی تعلیم حاصل کرنے کے فادرمانسٹریٹ کے
 سپرد کر دیا گیا لیکن اسی "اکبر دی گریٹ مغل" کے صفحہ ۲۵۲ پر اسی یسوعی لٹریچر کے حوالے سے اکبر کا ۱۷۵۹ء کا خط ڈاکٹر اسمتھ نے بغیر کسی نقد و
 تبصرہ کے درج فرما دیا ہے حالانکہ اس خط کا ایک فقرہ یعنی "تقدس آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یسوع مسیح کے مذہب کے علاوہ جو حقیقتہً خدا
 کا مذہب ہے میں دنیا کے ہر مذہب سے واقف ہوں اور اب میری یہ خواہش ہے کہ آپ پادریوں کو میرے دربار میں بھیجیں تاکہ میں ان سے مسیحی
 مذہب کے متعلق معلومات حاصل کر سکوں۔" اس کے مجہول ہونے کا بین ثبوت ہے، بایں معنی کہ جب ۱۷۵۸ء کا مسیحی مشن اکبر کو نصرائیت سے
 واقف بلکہ متاثر کر چکا تھا تو ۱۷۵۹ء میں اکبر نے اپنے مزعومہ خط میں یہ کیوں تحریر کیا کہ میں یسوع مسیح کے مذہب سے ناواقف ہوں؟ یا مثلاً
 "اکبر دی گریٹ مغل" کے صفحہ ۳۱۲ پر xav, v کے ایک خط سے یہ اقتباس پیش کیا گیا ہے کہ تقدس آپ ۱۷۵۴ء کے ایسٹر کے بعد
 اور ۶ ستمبر ۱۷۵۴ء سے قبل شاہزادہ سلیم اور شاہزادہ پروینت فچیور سیکری کے اچھے دوست ہوئے مگر میں نے تھے لیکن چونکہ شاہزادہ سلیم کا
 ۱۰ نومبر ۱۷۵۳ء سے لے کر ۹ نومبر ۱۷۵۴ء تک فچیور سیکری یا آگرے جانا کسی تاریخ میں بھی درج نہیں ہے لہذا دوسرے صفحہ پر ڈاکٹر اسمتھ کو
 تاویل کرنا پڑی یا تو xav, v کا مطلب ۱۷۵۴ء کے ایسٹر کے بجائے ۱۷۵۳ء کے ایسٹر سے ہے اور یا پھر شاہزادہ سلیم اپنے بھائی
 شاہزادہ دانیال کی خبر وفات سن کر ۱۷۵۴ء میں آیا مگر کسی مورخ نے عموماً یا سہواً ذکر نہیں کیا۔

اغلباً انھیں متضاد بیانات سے متاثر ہو کر مستشرقین یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ اکبر نے پادریوں کو بلایا کیوں تھا؟ — میک لاگن
 (MacLagan) کا خیال ہے کہ اکبر نے اپنے یورپین ملازمین کی وجہ سے ان کے مراسم مذہبی ادا کرنے کے لئے پادریوں کو بلوایا تھا۔ کاترو
 (Carrow) کا بیان ہے کہ جب ابوالفضل کو یہ یقین ہو گیا کہ اسلام ہندوستان کا قومی مذہب نہیں بن سکتا تو اس نے اکبر کو آمادہ
 کیا کہ نصرائیت کو قومی مذہب بننے کا موقع دیا جائے۔ ڈاکٹر اسمتھ کی رائے میں اکبر خالص سیاسی نقطہ نظر سے پادریوں کی وساطت سے گوا کے
 پرتگالیوں سے بظاہر مراسم برپا کر دراصل انھیں ہندوستان سے نکالنا چاہتا تھا اور خود گوا کا پرتگالی گورنر بھی دی سوز (De Souza)
 کے بیان کے مطابق یہ سمجھتا تھا کہ اکبر پادریوں کو بطور برغمال اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر پین کے نزدیک اکبر طالب حقیقت بھی تھا
 اور طلب حقیقت کے ساتھ ساتھ کچھ سیاسی اغراض بھی وابستہ تھے اور پروفیسر جے دھری نے مغل اور پرتگالی تعلقات کی سیاسی اہمیت
 کو نظر انداز فرما کر یہ رائے پیش کی ہے کہ جب تلسی داس، سور داس، مہاراجی رانا اور مہیرا وجے کے بلانے میں مورخ کوئی سیاسی مقصد
 نہیں برتا تو پادریوں کے بلانے کو کسی سیاسی غرض سے کیوں وابستہ کیا جائے؟ اکبر نے جس طرح عیسائی مبلغین کا استقبال کیا اور
 مراجع خسروانہ ان کے حال پر مبذول فرمائے وہ ڈاکٹر اسمتھ کے قول کی تردید کے لئے کافی ہیں۔ لیکن پروفیسر جے دھری نے نہ تو اکبر نامہ کی اس

۱۸۰ صفحہ "دین الہی" — ۱۷۵۷ء اکبر دی گریٹ مغل صفحہ ۲۵۲۔ ڈاکٹر اسمتھ نے اکبر نامہ جلد سوم کے حوالہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ عین
 اس وقت جب اکبر کے طلبیدہ پادری اس کے دربار میں حاضر ہونے والے تھے اکبر تمام پرتگالی بنادر فتح کرنے کے لئے ایک فوج اپنے کو کا قیام لین خان
 کی سپہ سالاری میں جمع کر چکا تھا۔

عبارت کو رد کیا جس میں پرتگالیوں کے خلاف قطب لدیپیا خاں کی سرکردگی میں فوج کی طیارسی اور مائوہ و گجرات کے صوبہ داروں کو اس فوج کی اعانت کرنے کا حکم ہے اور نہ انھیں خود اپنی "تالیف" دین الہی کی وہ متعدد توضیحات یاد رہیں جن میں انھوں نے بالتصریح ارشاد فرمایا ہے کہ نوروز جلالی ان ایرانی امراء کو خوش کرنے کے لئے جاری کیا گیا تھا جنھوں نے اکبر کے دربار صفویہ سے ماتحتانہ تعلقات منقطع کرنے سے ناراض ہو کر اکبر کے سوتیلے بھائی مرزا محمد حکیم کو بغاوت پر آمادہ کیا تھا اور چونکہ چتوڑ کے محاصرہ میں اکبر کی فوج راہبوتوں اور ترکوں پر مشتمل تھی لہذا راہبوتوں کو لحم خنزیر اور ترکوں کو شیر کا گوشت کھانے کی اجازت دی گئی۔ تعجب ہے کہ پروفیسر جودھری نے دفاتر ابوالفضل جلد اول صفحہ ۲۳ کی اس عبارت پر بھی غور نہیں کیا جو اکبر کے دلی خیالات کی آئینہ دار ہے :- "و پیش نہاد خاطر آن بود کہ چون این کار و بار سامان و سرانجام یابد شور و بختان فرنگ کہ در دریائے شور و آردہ سریشور انگیزی پر آورده اند و سنگ راہ دریانوردان ہفت کشور شدہ سیمایر زائرین حرمین شریفین زاد ہما اللہ شرفاً آذر بسیار می رسانند خود یورش نموده آن راہ را از پی خار و فاشاک پاک سازیم۔"

میں ڈاکٹر پین کی رائے سے قطعاً متفق ہوں کہ پرتگالی گورنر کو خط بھیج کر مسیحی پادری طلب کرنے میں ذوق تحقیق کے ساتھ سیاست مصلحت بھی شامل تھی ورنہ جہاں تک ذوق تحقیق کا تعلق ہے وہ بڑی حد تک تا داریس (Tavaris) پادری پیری راد (Rad) اور علی الخصوص کابل (Caval) سے گفت و شنید کے بعد ۱۵۵۷ء میں پورا ہو چکا تھا اور دسمبر ۱۵۵۷ء میں جو خط عبداللہ یا بقول ڈاکٹر اسمتہ سید عبداللہ خاں کے ہاتھ بھیجا گیا وہ غالباً ان پرتگالی مقبوضات کے حالات کی تفتیش کا بہانہ تھا جن میں اکبر ۱۵۵۷ء میں پرتگالیوں سے عہد نامہ مرتب ہونے کی بنا پر خود داخل ہو سکا تھا۔ اکبر کے ایلچی کا شاہانہ استقبال کیا گیا اور تین پادریوں کو بادشاہ کی خدمت میں بھیجا گیا لیکن باوجودیکہ ان تین پادریوں میں سے ایک شخص فرانسسکو انری کوئٹز دین اسلام چھوڑ کر عیسائی ہوا تھا ان عیسائی مبلغین نے پیغمبر اسلام کی شان میں وہ گستاخیاں کیں کہ عوام کا کیا ذکر ہے اکبر بھی منغض ہو گیا اور بالآخر مسلمانوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک مسلمان قرآن حکیم ہاتھ میں لے اور ایک پادری انجیل پھر دونوں آتش سوزاں میں داخل ہوں اور جسے گزند نہ پہنچے اسی کا مذہب حق سمجھا جائے لیکن باوجودیکہ "اکبر نے اطمینان دلایا کہ پادری کو کسی ترکیب سے بچا لیا جائے گا اور ملا کو جلا دیا جائے گا تقدس مآب اکیو دی وانے اس تجویز کو گناہ سمجھا اور آمادہ نہیں ہوئے۔" دفاتر ابوالفضل جلد اول میں "و اما ان فرنگ" کے نام پہلا اور آخری خط صفحہ ۳۹-۳۷ پر درج ہے۔ اس خط کی تاریخ تحریر ۲۰ شہر ربیع الاول ۹۹۷ھ مطابق اپریل ۱۵۸۷ء ہے یعنی پہلے عیسائی مشن کے زمانہ قیام میں جبکہ اکبر بائبل کی زیارت کر چکا تھا اس خط کو سید مظفر خاں کے ہاتھ روانہ کیا گیا اور اس خط میں بھی "شوق ما ہوا الحق" کے اظہار کے بعد "تباہ السنہ و تغایر لغات" کی مشکل کا ذکر کرتے ہوئے کسی ایسے شخص کو اکبر کے پاس بھیجنے کی فرمائش کی گئی ہے جو ان "مطالب عالیہ" کو "باحسن عبارت" "خاطر نشان" کرے اور اس کے ساتھ ساتھ اس خواہش کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ "لسمع ہمایوں رسیدہ کہ کتب سماوی مثل توریت و انجیل و زبور ہزبان عربی و فارسی و آوردہ اند اگر آن کتب مترجم یا غیر آن کہ افصح آن عام و فایده آن تمام باشد"

۱۔ حوالہ سابق صفحہ ۲۲-۲۱ - ۲۔ حوالہ سابق صفحہ ۲۸-۲۷ - ۳۔ اکبر دی گریٹ مغل صفحہ ۱۳۷-۱۳۶ - ۴۔ منتخب لتواریخ جلد دوم صفحہ ۱۲-۱۱ کے وقایع ۹۸۳ھ (یعنی ۱۵۷۵ء) سے مستفاد ہوتا ہے کہ عیسائیوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی بلکہ ان کے بعض عقلی عقاید بادشاہ کے ذہن نشین بھی ہو گئے تھے۔ ملا صاحب کے الفاظ یہ ہیں :- "و آمد و رفت فرنگیاں نیز شد و بعض اعتقادات عقلی ایشان را فرنگی فتنہ"۔ ۵۔ اکبر دی گریٹ مغل صفحہ ۱۷۶ - ۱۷۵ - ۶۔ حوالہ سابق صفحہ ۱۷۶ - ۱۷۵ - ۷۔ ملا عبدالقادر نے منتخب لتواریخ جلد دوم صفحہ ۲۹۹ پر اس واقعہ کو یوں تحریر کیا ہے "شیخ قطب جلیسری را کہ بجزا بے خرابے بود طلبہ ۱۱ احبار فرنگیاں در بحث انداختند۔ شیخ گفت آتش بلند افروزند تا من بمعارض خود در آیم و ہر کہ سلامت بر آید حق است ہم چنان کردند و او دست و کمر فرنگی زدہ گفت ہاں بسم اللہ و بیچ کلام از فرنگیاں جرأت نکردند و او را از غیرت ہمراہ نقیب چند دیگر و بکفر ستادہ تا ہماں جا در گزشتند۔"

در آں ولایت بودہ باشند فرستند" لیکن تعجب ہے کہ اس خط میں نہ ان پادریوں کا ذکر ہے جو ۲۸ فروری ۱۵۸۰ء سے لیکر ۱۵۸۳ء تک اکبر کے دربار میں حاضر رہے اور نہ اس بائبل کا ذکر ہے جو ۳ مارچ ۱۵۸۰ء کو ہریت پیش کی گئی تھی۔ ڈاکٹر اسمتھ نے "اکبر دی گریٹ مغل" صفحہ ۲۰۶-۲۰۵ پر اس سفارت کا ذکر کیا ہے جو قادر مانسریٹ کی رہنمائی اور سید مظفر کی سرکردگی میں یورپ روانہ کی گئی تھی اور جس کا سرگروہ سید مظفر ۵ اگست ۱۵۸۲ء کو سورت پہنچا تو مگر یہ سن کر کہ صرف ایک دن قبل دو عیسائی نو جوان تین تین کئے گئے عیسائی ممالک میں جانا مناسب نہ سمجھا اور دکن میں ردپوشیں ہو گیا۔ عبداللہ خاں، مانسریٹ کے ساتھ گوا گیا لیکن کئی مہینے تک جہاز نہ ملنے کی وجہ سے دل شکستہ ہو کر واپس آگیا۔ یہ سکتا ہے کہ دفاتر ابوالفضل کا مندرجہ بالا خط ہی وہ خط ہو جو شاہی سفیر سید مظفر کے سپرد کیا گیا تھا اور علامہ ابوالفضل نے جس مصلحت سے عبداللہ خاں اوزبک کے خط میں اسے دلی توراتن کے بجائے سپہدار توراتن لکھا، اسی مصلحت سے سلاطین فرنگ کو دانا یا بن فرنگ سے تعبیر کیا اس لئے کہ اس خط میں متعدد القاب ایسے ہیں جو دانا یا بن فرنگ یا گوا کے گورنر کے بجائے ایک بادشاہ کے شایان شان ہیں مثلاً "سیما در طائفہ علیہ ملوک کہ بزرگوارت الہی مشرق اختصاص دارم خصوصاً بآں سلطنت آں خلافت قباب مورد تجلیات معنوی محی مراسم عیسوی الغنی عن التعریف والتوصیف"۔ یا مثلاً "رعایت حقوق چهار دمجت بآں عمدہ سلاطین نامدار محقق و موکر"۔ اسی طرح اس خط کا یہ فقرہ کہ سادق العقیدہ والا طافاں سخنے چند بالمشافہ خواہر گفت اعتماد نمایند" اس بات کا غماز ہے کہ پادریوں کو طلب کرنا یا بائبل منگوانا بہانہ تھا دراصل مکتوب الہیہ تک کوئی اہم زمانی پیغام پہنچانا تھا۔ بہر نوع شاہی سفارت بھی ناکام رہی اور پہلا تبلیغی مشن بھی چند روزی غلاموں کو واپس لے جانے کے علاوہ ہر طرح خاسر و نامراد گوا واپس گیا۔

۱۵۸۳ء میں پہلے عیسائی مشن کی واپسی سے لے کر ۱۵۹۰ء تک اکبر، دین الہی کی تبلیغ اور سندھ وغیرہ کی فتوحات میں اتنا مشغول رہا کہ اسے عیسوی پادریوں کا خیال تک نہ آیا، ہاں ۱۵۹۰ء میں ایک یونانی پادری لیوگرمن سے ملاقات ہونے کے بعد اکبر نے اس کی وساطت سے سے ایک خط گوا بھیجا، اور اگرچہ ڈاکٹر اسمتھ نے "اکبر دی گریٹ مغل" کے صفحہ ۲۲۹ پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اکبر کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ ۱۵۹۰ء میں دو عیسائی مذہب اختیار کرنے پر آمادہ تھا لیکن خود ڈاکٹر اسمتھ کو دوسرے صفحے کے دوسرے فٹ نوٹ میں لیوگرمن کے پروانہ

۱۔ دفاتر ابوالفضل جلد اول صفحہ ۱۴۔ اس خط میں ایران کے قضیہ نامرضیہ کے علاوہ شاہ رخ مرزا کے دربار اکبری میں پناہ لینے کے واقعہ کو بھی یہ کہہ کر سبک کرنے کی کوشش کی گئی ہے "ہر چند کہ از دوستی و خویشی کہ بمادارند چشم پوشیدہ شود اور اچہ پایہ آں بود کہ بے ادبانہ پیش آید۔ انکوں چوں شاہ رخ مرزا بایں جانب رسیدہ است، جز ہرانی نمودن و از کار ہائے او فراموش کردی چیزے دیگر در دل نمی گزرد و امید از دوستی و خویشی آں والاد و ماں نیز چنانست کہ از گستاخی او چشم پوشند" لیکن نفس امر میں طرح بساط اکبری میں دو جہے یعنی مظفر حسین میرزا صفوی اور رستم میرزا صفوی شاہ عباس اعظم کو مات دینے کے لئے موجود تھے اسی طرح یہ جہرہ دلی توراتن کو زچ کرنے کے لئے جیا کر دیا گیا تھا چنانچہ فرمائے خانہ میں خط میں صفوہاء پر صاف صاف لکھا ہے کہ عبداللہ خاں اوزبک کے ایچی "با تحف و ہدایاے متوافرہ مکر بطریق تواتر و توالی"۔ آگئے ورنہ عنیم تمیم تھا کہ "بدخشاں را متخلص ساختہ بمیرزا شاہ رخ مرحمت فرمایم"۔

۲۔ جیسا کہ ادراک گزشتہ میں بکرات و مرات بیان کیا جا چکا ہے اکبر اپنے آپ کو تو خیر خلیفۃ اللہ فی الارض سمجھتا ہی تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہر مذہب ملت کے بادشاہ کو ظلی الہ اور مافوق البشر سمجھتا تھا چنانچہ جب حبیب اللہ یورپ سے "سازارغیوں کہ از عجائب مخلوقات است" لائے اور اس صندوق کے اندر بیٹھ کر ایک فرنگی نے باجا بکلا تو اکبر نے اس بے شکافت مجلس میں یہ سوال کیا "کہ ہر کس گوید کہ دریں جزو زمان عقل ناس بزرگم او کیست ؟" لیکن اس بے شکافت صحبت میں بھی یہ قید عاید کر دی کہ "ہم بادشاہان ہندوستان اند" (منتخب التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۹۱) میرے خیال میں دانا یا بن فرنگ سے یقیناً سلاطین فرنگ مراد تھے ورنہ اکبر اس طرح کے القاب نہ تحریر کرتا۔ طالعہ صفوی

راہداری میں یہ تشریح کرنا پڑی ہے کہ ”چونکہ اکبر اپنے آپ کو صرف محمد کبھی نہیں لکھتا تھا لہذا اس پر دائرہ راہداری کی نقل میں تسامح ہوا اسی طرح فرامشی ترجمہ میں بادشاہ Jossima اور دیوجیک کی لاطینی اصل میں Dominus Jossima کے الفاظ مبہم ہیں“ اور اصل خط کے متعلق میں اس سے قبل اشارہ کر چکا ہوں کہ اس میں اکبر کی نصرائیت سے ناواقفیت کا اظہار تھا اس کے مجہول ہونے کا بین ثبوت ہے یعنی ڈاکٹر اسمتھ کے علی الرغم اکبر کے الفاظ نہ پروانہ راہداری میں ہیں نہ اصل خط میں۔ بہرغور ۱۵۹۱ء میں دوسرا تبلیغی مشن آیا اور ۱۵۹۲ء میں پھر ناکام واپس ہوا۔ جہاں تک عیسائی مذہب کی تبلیغ کا سوال تھا یہ دوسرا تبلیغی مشن بے شک ناکام رہا اس لئے کہ دین الہی کے شیوع کے بعد اکبر خود رہنما بن چکا تھا اب کسی کو اس کی رہنمائی کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس پہلے تبلیغی مشن کے ”دلائل و تراویح ملک فرخچہ کہ ایشان را پا و ہری گویند“ کی تبلیغ اور ربع میں آنے والوں کی سعی تبلیغ کا اتنا اثر ضرور پڑا تھا کہ ملا عبدالقادر کو منتخب تواریخ کی جلد دوم صفحہ ۳۰۴ پر یہ تحریر فرمانے کا موقع مل گیا ”و نواعتن ناقوس نصاری و تماشائے صبرت ثلثہ و بلبلاں کہ خوش گاہ ایشان است و سایر لہو لعب و طیفہ شد و کفر شایع شد تاریخ یافتند“ لیکن چونکہ ملا صاحب نے یہ واقعات بظاہر ۹۹۰ھ کے واقعات کے تحت تحریر فرمائے ہیں اس لئے ان کا براہ راست تعلق دوسرے تبلیغی مشن سے ثابت نہیں ہوتا اور چونکہ کفر شایع شد کے اعداد سے ۹۹۵ھ لگتا ہے لہذا ”نواعتن ناقوس وغیرہ“ پہلے تبلیغی مشن کے درود سے پیشتر بھی قبل یعنی قادہ تا واریس اور قادہ پیری را کی تبلیغ کی وجہ سے ۹۹۵ھ مطابق ۱۵۸۲ء میں رائج ہو چکا تھا اور ثالث ثلثہ پر دلائل پیش کرنے اور شاہزادہ مراد کو سبق پڑھانے کے علاوہ پہلا مشن اور چند امیر زادوں کو پرتگالی زبان سکھانے کے علاوہ دوسرا تبلیغی مشن ہر حیثیت سے ناکام مایاں تھا۔ تیسری اور آخری دفعہ ۱۵۹۳ء میں اکبر نے گوا کے پادریوں کو دربار شاہی میں طلب فرمانے کے لئے گوا کے والٹر کے کو پھر خط لکھا اور اگرچہ اکبر کا ”فتح بنادر“ کا قصد جو اس نے ۱۵۸۲ء تک قادہ مانسٹرٹ سے پوشیدہ رکھا تھا اور اب اس قدر عام ہو گیا تھا کہ دیوجیک نے یسوعی پادریوں کے خطوط کے اقتباسات میں بالتصریح تحریر کیا ہے کہ ہر کس و ناکس جانتا ہے کہ اکبر گوا اور دوسرے پرتگالی مقبوضات پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور اس نے بعض مواقع پر اپنے درمیں سے صاف صاف کہا کہ کن کی ہم ختم ہو جانے پر گوا پر حملہ کیا جائے گا، تاہم جس طرح ”اکبر کے سفارتی مشن بظاہر عجائبات فرنگ خریدنے یا پادریوں کو بلانے کے لئے اور باطن جاسوسی کرنے کے لئے آئے تھے اسی طرح یسوعی پادری علی الخصوص

۱۔ اکبر دی گریٹ مغل صفحہ ۲۵۵ — ۲۔ منتخب تواریخ جلد دوم صفحہ ۲۶۰ — ۳۔ عیسائیوں کے گرجے کی گفٹیاں ہوں یا مندروں کی اکبر بظاہر عبادت کے اوقات میں ہر قسم کے شور و غل کو ناپسند کرتا تھا چنانچہ قدسی کلمہ ۱۰۹ میں صاف صاف کہا ہے کہ ”در نواعتن ناقوس و باواداشتن بوق نہ کام پرستش از ہندیان گزیر پسنخ نشند و ہم ہمانا دست مایہ خطرہ بندی و دل جمعی ہم سازند“ (آئین اکبری جلد سوم صفحہ ۱۸۴)

۴۔ اکبر دی گریٹ مغل صفحہ ۱۰۴ — ۵۔ عیسوی اور ہجری سنین کی مطابقت میں میں نے اکبر دی گریٹ مغل کے مصنف کی تحقیق پر اعتماد کیا ہے۔

۶۔ منتخب تواریخ جلد دوم صفحہ ۲۶۰ — ۷۔ اکبر دی گریٹ مغل صفحہ ۲۵۵ — ۸۔ ابوالفضل نے آئین اکبری جلد دوم صفحہ ۱۱۶ پر غیر ملکی مقبوضات کا ذکر اس طرح کیا ہے ”از بے پروائی کار برداران دولت و سپہ سالاران سرحد بسیار ازین کار بدست فرنگ چوں دمن و سجان و تارا پر و داہم و بیسی کہ ہم شہر و ہم ہند راند“ اکبر ۱۵۹۴ء سے بہت پیشتر عبداللہ خاں اوزبک کو تحریر کر چکا تھا کہ شوریدہ بختان فرنگ کو حرمین شریفین کی راہ سے خن و خاشاک کی طرح پاک کرنے کی ہم صرف اختلال ایران کی وجہ سے ملتوی کی گئی ہے (دفترا ابوالفضل جلد اول صفحہ ۲۳) لیکن اب جبکہ اکبر کو نہ ایران سے خطرہ تھا نہ توران سے خوف اس نے برہان نظام الملک مسند نشین احمد نگر کو صاف صاف لکھا کہ ”چہ از آن بہتر کہ غنیمت بتائید دولت ابد پیوند ما با ہم اتفاق نموده باعث فتوحات فرنگستان و سایر بنادر شوند“ (حوالہ سابق صفحہ ۷۷) لیکن جس طرح شاہ عباس اعظم بحری طاقت کے فقدان کی وجہ سے انگریزوں کی مدد کے بغیر پرتگالیوں کو جزیرہ ارمز سے نکال نہ سکا اسی طرح بحری قوت کی کمی کی وجہ سے اکبر کا ”فتوحات فرنگستان و سایر بنادر“ کا خواب کبھی بھی خرمندہ تعبیر نہ ہو سکا اور گلبدن بیگم کے واقعہ فاجعہ کے بعد قطب الدین نے خشکی کے راستے سے دمن پر حملہ کیا تو خود اکبر نے قطب الدین کو واپس بلا لیا۔

تیسرے تبلیغی مشن کے پادری مذہبی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ اسپین اور برٹنگال کے پولیٹیکل ایجنٹ بنا کر بھیجے گئے۔^{۱۵}

چونکہ نظام الدین احمد کی طبقات اکبری میں ۱۵۹۳ء تک کے حالات اور ملا عبدالقادر کی منتخب التواریخ میں اگست ۱۵۹۵ء تک کے واقعات درج ہیں اور چونکہ ابوالفضل نے دہلہ آخر کے سوانحات میں نہایت اجمال سے کام لیا ہے بنا براین تیسرے تبلیغی مشن کے واقعات صرف ”اکبری گریٹ مغل“ سے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ اس تیسرے تبلیغی مشن کے مبلغین نے بھی اپنے پیش رو احبار کی طرح افسانہ طرازی کو حقیقت نگاری پر ترجیح دی یعنی فادر Xavere نے یہ بیان کیا کہ ”بادشاہ نے محمد کو اپنے دماغ سے (معاذ اللہ) خارج کر دیا ہے اور اب اس کا رجحان منہ دھرم کی طرف ہے وہ خدا اور سورج کی پرستش کرتا ہے اور پیغمبری کا دعویٰ بن کر شفا بخشی کا دعویٰ کرتا ہے۔ شاہزادہ سلیم بھی (معاذ اللہ) محمد کا استہزاء کرتا ہے“ اور فادر بن میر (معن ص ۷۷) نے یہ ارشاد فرمایا کہ ”بادشاہ نے محمد کے (معاذ اللہ) جھوٹے مذہب کا خاتمہ کر دیا ہے اور اب اس شہر میں نہ کوئی مسجد باقی ہے نہ قرآن۔ مسجدوں سے اصطبل اور ذخائر کا کام لیا جاتا ہے اور مسلمانوں کو جلانے کے لئے ہر جمعہ کو چالیس پچاس خنازیر کی لڑائی بادشاہ کے رو برو ہوتی ہے اور بادشاہ ان کے دانتوں پر سونا چڑھوا کر رکھ لیتا ہے۔ بادشاہ نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے اور اپنے آپ کو اس مذہب کا پیرو سمجھتا ہے اور متعدد افراد نے روپے پیسے کی لالچ کی وجہ سے یہ نیا مذہب قبول کر لیا ہے۔ بادشاہ خدا اور سورج کی پرستش کرتا ہے اور جینی فریقے کا مہندو ہے۔“ سمجھ میں نہیں آتا کہ اکبر کو بیک وقت دین الہی کا موجد اور مرسل کہنے کے ساتھ ساتھ جینی یا ہندو کیوں فرمایا گیا اور وہ کون سا شہر تھا جس میں نہ قرآن حکیم کا کوئی نسخہ باقی بچا تھا اور نہ کوئی مسجد محفوظ تھی؟

تیسرے مشن کے مبلغین کو احبار سابقین کی طرح شروع میں یہ توقع بھی ہوئی تھی کہ مقدس مورتوں کی تعظیم و تکریم اور عبادت میں حصہ لینے کے یہ معنی ہیں کہ اکبر عیسائی مذہب قبول کرنے پر آمادہ ہے مگر جس طرح ”تماشائے صورت ثلاثہ“^{۱۶} وحدت وجود کی حمایت میں بس یہ شکل اختیار کر سکا کہ ”شیخ ابوالفضل بجائے بسم اللہ ایں فقرہ نوشت اے نامی دی ژڈ و کرستو و شیخ فیضی مصرع دوم چنین گفت مع سبحانک لا سواک باہو“ اور اکبر ایسا موجد تثلیث پرست نہ بن سکا اسی طرح اس تعظیم و تکریم نے عیسائی مذہب کی صورت اختیار نہ کی اور نہ دم آخر تک اکبر عیسائی بنا اور نہ دین الہی میں عیسائی عنصر اثر انداز ہو سکا۔

محمد عباس طالب صفوی

- ۱۵ اکبری گریٹ مغل صفحہ ۲۶۲
- ۱۶ حوالہ سابق صفحہ ۲۶۰
- ۱۷ اکبری گریٹ مغل صفحہ ۲۶۲ - اس خوش گمانی کی تردید خود ڈاکٹر استتمہ کو آئندہ صفحات میں بایں الفاظ کرنا پڑی ”ہر وہ شخص جو سلیم کی شاہزادگی اور بادشاہی کے زمانہ کی تاریخ سے واقف ہے سلیم کی نصرانیت سے موافقت کے ذکر کو سن کر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا“ (اکبری گریٹ مغل صفحہ ۶۵ - ۲۶۲)
- ۱۸ حوالہ سابق صفحہ ۲۶۲
- ۱۹ منتخب التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۰۴
- ۲۰ حوالہ سابق صفحہ ۲۶۰
- ۲۱ اکبری گریٹ مغل صفحہ ۳۲۳

نیا زکی ڈائری کے چند اوراق

الہ آباد کا میوہاں تماشائیوں - فوجوان تماشائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ سامنے ڈانس پر ایک طرف تمام وہ ساز جو ہندوستان کی موسیقی کا ساتھ دے سکتے ہیں، قریب سے چنے ہوئے رکھے ہیں اور دوسری طرف چند فوجوان لڑکیاں اور چند بہت مسن، حال و مستقبل کے تمام امکانات حسن و عشق لئے ہوئے جلسے کا انتظار کر رہی ہیں۔ سیاہ بورڈ پر ایک لڑکی کے رقص کا اعلان نظر آتا ہے۔ اور ڈانس سے نیچے الہ آباد یونیورسٹی کے ایک پروفیسر بحیثیت ناظم جلسہ گھنٹی بجا کر آغاز کی اجازت دیتے ہیں۔

سازندے، تعلیم یافتہ سازندے اپنا اپنا ساز سنبھال کر ہم آہنگی کے ساتھ موسیقی کی پہلی آواز کھرج کے پردوں سے پیدا کرتے ہیں اور ایک لڑکی جس کی عمر زیادہ سے زیادہ آٹھ سال کی ہوگی۔ سر میں پھولوں کا ہار اور پاؤں میں گھونگھرو لپیٹے ہوئے سیم کی پہلی ضرب کے ساتھ نمودار ہوتی ہے۔ گویا ایک نوخاستہ تیرتی ہے جو پوچھتے پیدا ہوئی اور سورج کی سب سے پہلی کرن پر رقص کرتی ہوئی یہاں پہنچ گئی ہے۔ اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کی جنبش، اس کے ناتوان و کمزور اعضا کی لرزش، فاختہ کی طرح اس کے چھوٹے چھوٹے سرخ پاؤں سے لپٹے ہوئے گھونگھروں کی باقاعدہ جھنکار۔ ایک ایسا سماں تھا جو حال سے قطع نظر اس کے امکانات مستقبل کو پیش کر رہا تھا۔ لڑکی انھیں پروفیسر صاحب کی تھی جو اس جلسہ کے مہتمم و نگران تھے۔ اس کے بعد اور چند چھوٹے چھوٹے بچوں اور بچیوں کی طرف سے نمائش فن ہوئی اور بڑی حد تک کامیاب۔ لیکن اس کے بعد جب دفعہ بورڈ پر دمس بن پانی مکر جی، کا نام نظر آیا تو لوگوں کے احساس میں، میں نے خاص اضطراب محسوس کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی دبا ہوا جذبہ دل سے زباں تک آنے والا ہے۔ جذبہ بے اختیار شوق! —

چودہ پندرہ سال کی ایک بنگالی لڑکی۔ بنگالی اپنے سانولے رنگ کے لحاظ سے۔ اپنے لائے لائے سیاہ بالوں کے لحاظ سے۔ بڑی بڑی آنکھوں اور کتابی چہرہ کے لحاظ سے۔ نازک قامت، لمبلا بدن، شرمیلی ہوئی چٹون، سرخ ساری، سرخ بیندی۔ ہار مونیم پریشی تیلی نازکی انگلیوں کی متواتر جنبش اور ایک سماوی لحن کے ساتھ جو نیپوری کی دلورنگی! معلوم نہیں اور لوگوں پر کیا کیفیت طاری تھی۔ لیکن میری روح کا اعتراف شکست اگر بیان میں آسکتا ہے تو وہ صرف یہ تھا کہ:-

کفر چندیں سال گری ایاں می برد

آہ از کی نزاکت کی تعریف مومن نے یہ کی ہے کہ:-

اسے ہمنفس نزاکت آواز دیکھنا

و شام یار طبع حزیں پر گراں نہیں

لیکن یہاں معاملہ صرف آواز کا نہیں تھا بلکہ لحن و موسیقی کا تھا۔ اس لئے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بولوں کے آثار چڑھاؤ کی نرم نرم پھانس دل کے اندر پورست ہوتی جا رہی ہیں۔ اور جب وہ دفعہ دہ سری سہنگ سے استانی کے بول ختم کر کے تان لیتی ہوئی کھرج کے پردوں تک آتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شعلہ لپکا اور پھیل کر رہ گیا۔ پہلی جگہ اور فضا کو منور کر گئی۔ یہ لڑکی بول پور (بنگال) کی رہنے والی ہے اور غالباً شانتی "نکتن" میں اس فن کی تکمیل کی۔

شام کے جلسہ میں بولپور کی دوسری لڑکی "مس مترامرا" نے اُس جدید فنِ رقص کی نمائش کی جو ٹیگور اسکول کی خصوصیت سمجھا جاتا ہے اور جس کو موسیقی حرکات (Action music) کہتے ہیں۔ اس نے اپنے رقص کے ذریعہ سے "شیو" کی اُن آلبانہ حرکات رقصہ کو پیش کیا جو ہندو علم الاصنام کے شعبہ فنونِ لطیفہ کی جان سمجھے جاتے ہیں۔ وہ جس وقت اپنے پاؤں کو آہستہ آہستہ اٹھا کر فرش کی طرف مایل کرتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ سارے کرۂ ارض پر چھا جاتا چاہتی ہے اور جب اپنے ہاتھوں کو بلند کر کے نرم و نازک انگلیوں کو اوپر کی طرف تان لیتی تھی تو اس کے پچھلے جسم کے تمام بیج و خم کے ساتھ یہ منظر کچھ ایسی کیفیت کا اظہار کرتا تھا جو عام رقص میں یقیناً کبھی نہیں پائی جاسکتی۔ اس لڑکی کے کتابی چہرہ کے نازک نقوش پسینے سے ہونٹ اور کھنچی ہوئی بھوئیں جو جذبہ پرستی کی کھلی ہوئی علامتیں ہیں۔ اس وقت زیادہ تر ایک دیوی کی سی خودداری کو ظاہر کر رہی تھیں اور جسم کے توڑ مروڑ کا تو یہ عالم تھا گویا اس کی ساخت میں صرف زاویوں اور خطوط سختی سے کام لیا گیا ہے۔ خط مستقیم سے کوئی واسطہ نہیں۔

دوسری شام کے جلسہ میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ اور اتنا ہی تباہ کن منظر وہ تھا جب الہ آباد یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کی نوجوان صاحبزادی نے اپنے اکتساباتِ فن رقص کا مظاہرہ کیا۔ نوعیت اور شخصیت دونوں حیثیت سے یہ رقص اُس رقص سے یک گونہ جدا تھا جس کا ذکر ابھی کیا گیا۔ کیونکہ وہ رقص خداوندی تھا اور یہ رقص بندگی۔ اگر اُس میں شیو کے غور و پندار کو پیش کیا گیا تھا تو اس میں ایک مرنی کی سی پرستارانہ سپردگی اور فتادگی کو۔ اُس میں صرف آرٹ تھا اور اس میں آرٹ کے ساتھ لسانیات بھی شامل تھی۔ اُس کو دیکھ کر روح دھڑکتی تھی اور اس کو دیکھ کر دل !

اس لڑکی کا رنگ صاف جسم صحیح و توانا اور اعضا سدھول تھے۔ اس کے جسم کی جنبش اور حرکات رقصہ کی لرزش بہت زیادہ محسوس و مرنی تھی اور اگر چشم و ابرو کی سنجیدگی کو ملحوظہ کر دیں تو اس میں تمام وہ کیفیات پائی جاتی تھیں جو انسان کو آرٹ سے زیادہ مطالعہِ حسن کی طرف مایل کر دینے والی ہیں مجھے اوروں کے احساس کی خبر نہیں لیکن کم از کم میں ضرور یہ خیال لیکر اٹھا کہ اکتسابِ فن کے لحاظ سے ایک اونچے گھرانے کی شریف لڑکی زیادہ سے زیادہ اتنی ہی ترقی کر سکتی ہے۔ لیکن جب قیصری شب کی صحبت میں مس آسا کماری نے اپنے معجزاتِ فن پیش کئے تو میں حیران رہ گیا اور میری سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ کس قوم کی عورتوں پر "آج" اس طرح طلوع ہوا ہے اس کا "کل" کیا ہو سکتا ہے۔

اس دور کی آزاد و تعلیم یافتہ لڑکیوں کی عمر کا اندازہ کرنے میں ہمیشہ مجھ سے غلطی ہوتی ہے اور باوجود انتہائی احتیاط کے ہمیشہ دو چار سال آگے بڑھ جاتا ہوں۔ لیکن میرے ایک رفیق ہیں (بالکل میرے برعکس بجائے افراط کے تفریط کے عادی ہیں) ان کی رائے ہے کہ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ تیر و چودہ سال کی ہوگی۔ بہر حال اس کی عمر اتنی ہو یا اس سے بھی کم۔ اپنے احساس کے لحاظ سے وہ یکسر بچہ شہاب و رعنائی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کل، پھول جانے کے لئے صرف صبح کا انتظار کر رہی ہے۔

اس نے آتے ہی نہایت متین انداز سے کھڑے ہو کر پہلے ساد کی آوازوں پر غور کیا اور پھر سر کے اشارہ سے اسی کو کسی مقررہ تال پر قائم رہنے کی ہدایت کر کے اس طرح خاموش کھڑی ہو گئی۔ گویا کہ وہ کسی دیوی کا سنگین مجسمہ تھی جس کے حضور میں نغمہ عبودیت گونج رہا تھا اور جس کی پوجا کرنے کے لئے تے لوگ جمع ہو گئے تھے۔

آخر کار چند لمحوں کے سکوت و انتظار کے بعد اس خوبصورت مورتی میں جنبش پیدا ہوئی اور ایک طرف جسم کو چپکا کر کرپہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس قدر نرمی و نزاکت سے آگے بڑھی گویا کہ طلوع صبح کا اولین احساس تھا، جو نسیم کے سب سے پہلا جھونکے کے ساتھ بچائے باصرہ کے روح و دماغ کو کو متاثر کرتا ہے وہ آگے بڑھتی رہی، اپنے رنگین و نازک پنجوں کی ٹھوک سے گھونگھول میں ہلکی سی جھٹکا پیدا کرتی ہوئی برابر بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ سم آیا اور پاؤں کی ہر قوت ضرب سے گھونگھولوں میں ایک ہلکا مہ پیدا کر کے پھر اس طرح خاموش کھڑی ہو گئی۔ گویا وہ زمانہ کے انقلاب و سکون کا مطالعہ کر رہی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ عام بازاری عورتوں کی طرح اس کی چشم و ابرو کی جنبش میں کوئی بہام و نوید نہ پایا جاتا تھا۔ اس کی مرنی کی جنبش یا بدن کی تھرتھری میں طلبِ نوجوان کا کوئی سوتیانہ انداز مضمر نہ تھا۔ لیکن اگر سوال صرف تباہی و بربادی سے پناہ مانگنے کا ہو تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اُن سے زیادہ بے پناہ نہیں۔ اور کس میں اتنا ضبط و تحمل ہے کہ اپنی قربانیاں پیش کرنے کے لئے طلب و تقاضا کا انتظار کرے۔

اس کا صندلی رنگ اس وقت تکمیل فن کے پندار سے گلابی نظر آتا تھا۔ اس کی وسیع پیشانی پر ابروؤں کا خم ایک خود دارانہ احساس کو ظاہر کر رہا تھا جو کمال کی خصوصیت خاصہ ہے۔ اس کے پنکھڑی ایسے نازک لبوں کی لرزش خفی بتا رہی تھی کہ اس کے ناقابل ضبط جذبات میں ساز کے تاروں سے زیادہ نازک ارتعاش پایا جاتا ہے اور اس کے سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم نازنین کی بار بار پچک سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بجلی ہے جو تڑپ کر باہر نکل آنے کے لئے بے قرار ہے۔

اُس کے رقص میں نہ متر کا اکہانہ انداز تھا۔ نہ بھٹا چار یہ کا سپا سگنڈا رانہ۔ بلکہ یہ وہ کلاسیکل چیز تھی جو موسیقی سے بہ حیثیت فن پیدا ہوئی اور جس کے بڑے علمبردار لکھنؤ میں کالکا اور بندادین تھے۔ وہی توڑ سے اور وہی ماتروں کی تقسیم۔ وہی رام سنگرانہ عشوے اور جذبات عشق کی تحلیل و تنظیم۔ الفاظ کیفیات کے اظہار سے قاصر ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کی زبان کبھی کسی آرٹ کی تکمیل کا اعتراف کرنے پر قادر نہیں ہو سکتی۔

بمبئی آئے اور اس چیز کو جسے آپ نے فحشپور کی ویرانیوں میں گم کیا تھا، ساحل قلاب پر ڈھونڈ لے لیجئے۔ جس وقت آخری بار میں آپ سے ملا تھا۔ اس کے بعد سے دنیا کے ساتھ میں بھی بقدر وس سال ضعیف ہو گیا ہوں، لیکن اس کا کیا علاج کہ شباب میرا ساتھ چھوڑنے پر راضی نہیں۔ اگر حسن کی پیداوار جاری ہے تو سمجھ لیجئے کہ میری بخت سا لگی بھی ایک مستقل بالذات جو ہر غیر فانی ہو کر رہ گئی ہے۔ آپ کو یقین نہ آئے گا، لیکن میرا تجربہ ہے کہ جس چیز کی زکوٰۃ ادا کرتے رہئے اُس میں ترقی ہوتی رہے گی۔ زکوٰۃ حسن سے افزونی جمال کا حال تو مجھے معلوم نہیں لیکن شباب کے باپ میں اس مسئلہ کی صداقت پر مجھے کامل اعتقاد ہے۔ آپ کہیں گے کہ ایک جگہ کے بعد میں نے آپ پر اثبات وجود بھی کیا تو کس انداز سے۔ لیکن کیا کوئل آپ کو یاد کرنے کی فرصت مل گئی ہے۔ تو جی نہیں چاہتا کہ آپ کو اس لطف سے بیکار رکھوں جو مجھ پر ایک نشہ کی طرح طاری ہے۔ غالب کی اس حسرت کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ :-

”کجا زہرہ صبح و جام بلور“

اور یقیناً یہ اجتماع بڑی ”خدا ساز“ بات سمجھی جاتی ہے، یعنی مذہب اس زندگی میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتا اور کھپر لٹا یہ ہے کہ اس کی شکایت بھی کی جاتی ہے۔ حالانکہ جو چیز ترک اسلام کے بعد حاصل ہو سکتی ہے وہ ترک اسلام ہی کے بعد ملے گی۔ یہاں نہ کوئی دعا تھی نہ اس کے رد و قبول کا جھگڑا، فکر فضول تھی اور جرأت رندانہ، پھر کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا کہ ”زہرہ صبح بھی ہے اور جام بلور بھی“ اور چہار دم بھی ہے اور یادہ انگور بھی۔ آپ کو یاد ہو گا۔ جب میں ساری دنیا کا غم دل میں لئے ہوئے تڑپتا تھا، آپ کا کُنات کو فراموش کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ دنیا نام ہے صرف اپنا اور ”اُن“ کا۔ ہمیں جائے من و جائے تو باشد! کیا آپ کبھی میرا یہ احسان فراموش کر سکتے ہیں کہ میں نے اس عالم میں بھی آپ کو یاد کیا۔!

اس دس سال کے زمانہ میں مجھ پر کیا گزر گئی آسمان کا ایک ایک ستارہ اس سے واقف ہے، فضا کے بسیط اس داستانِ درد سے شاید اب بھی لبریز ہوگی، اگر آپ اس نوائے راز کے محرم ہوں تو سن لیجئے، سمجھ لیجئے مجھے اس کے اعادہ و تکرار پر مجبور نہ کیجئے، مجھ سے تو اب صرف یہ پوچھئے کہ :- ”جب ساری دنیا سوتی ہوتی ہے تو تم کیا کرتے ہو؟“ تمیر کی طرح میں آپس نہیں کرتا، گردنیں نہیں بدلتا، آنسو نہیں بہاتا۔ میں جاگتا رہتا ہوں، میرا طالع جاگتا رہتا ہے، نہ سوتا ہوں، نہ سونے دیتا ہوں، ہنستا ہوں، ہنساتا ہوں، مجروح ہوتا ہوں، مجروح کرتا ہوں، یہاں تک کہ میری دنیا میں صبح کا آفتاب دن کو بارہ بجے طلوع ہوتا ہے اور اس وقت بھی کوئی یہ کہہ کر ایک ریشمی معطر چادر میرے سر پہ کھینچ کر ڈال دیتا ہے کہ: ”ہوگا بھی“ اور میں پھر غافل ہو جاتا ہوں

”دیلم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم“

ذرا صبر کیجئے میں آپ کو ابھی اور جلدانا چاہتا ہوں۔ آپ کو یاد ہو گا جب ہم آپ کسی وقت ایک ”رند شاہ باز“ کی فرضی تصویر کھینچ کر گنیشوں خیالی لطف حاصل کیا کرتے تھے۔ مجھے خبر نہیں آپ کس عام میں ہیں، لیکن یاد رکھیے کہ علی دنیا میں آنے کے بعد ہی یہ حقیقت روشن ہو سکتی ہے کہ بڑے سے بڑے شاعر کا خیال بھی اُس ادا کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا جو بے اختیارانہ طور پر بیک وقت تمام وہ قیامتیں جو

ابھی تک اہم میں پوشیدہ ہیں کسی کے لب لا جنبش چشم و ابرو سے نکل کر دل کو مسحور کر لیتی ہیں۔ خدا کی قسم رند ہونا بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ لوگ اپنی تباہیوں پر مذہبی تسکین کی جستجو کرتے ہیں جہاں سے دے کے بڑی کائنات "دعا ہے" یا "تقدیر" ذرا ان دونوں کی بے نیکی کو ملاحظہ کیجئے۔ معاذ اللہ۔ اور پھر اس کے بعد بھی سکون معلوم۔ برخلات اس کے میری دنیا کے مراتب و مدارج کو ملاحظہ کیجئے کہ یہاں ہر سربادی ایک اشارہ ہے اور ہر ناکامی اعترافِ لطف۔ آپ ہی انصاف کیجئے کہ شکایت و شکریہ میں کتنا تفاوت ہے۔ ایک وہ ہیں جو ظلم سے ڈرتے ہیں اور ایک وہ جوستم کو دعوت دیتے ہیں، اورستم بھی شدید ترین ظلم۔ آپ جانتے ہیں وہ کیا ہے؟ التفاتِ فراوان۔ لطفِ بسیار۔ اچھا اندازہ کیجئے۔ "وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے" اگر صرف اپنی آغوش کے لئے وقف ہو، تو کیا ہو؟ دررغائب کے فلسفہ کے لحاظ سے یہ ہو کہ خدا بھی رشک کرے دنیا کا کیا ذکر ہے، اور میں۔ اب یہ نہ پوچھئے، کیونکہ اس بربادی کا افسانہ دیتے سے تعلق رکھتا ہے، سننے کی چیز نہیں۔ اب میں ختم کرتا ہوں، لیکن ایک بات اور سن لیجئے۔ نگاہِ اولیں کا افسانہ ہے اس کی لذت کو میں اب تک چھپائے ہوئے تھا۔ خیر تفصیل کا موقع نہیں اور نہ جرات مختصر کہنے میں خدا جانے آپ سمجھ سکیں یا نہیں۔ خیر یوں سمجھئے کہ۔ پیامِ روح تھا، نویدِ فردوس تھا، اور زیادہ غیر دلچسپ مذہبی زبان میں اشارہ غیبی تھا، الہامِ فطرت تھا۔ ہاں لبوں سے زیادہ پُر لطف وہ بوسہ ہے جو ایک نگاہ جھپک کر دوسری نگاہ کو دیتی ہے۔ اسی کے یہ مختلف نام ہیں۔ آپ کو جو پسند ہو انتخاب کر لیجئے، میں اسے صرف "خدا کو بھلا دینا" کہتا ہوں۔ کیونکہ انتہائی لذت وہی ہو جس کی ابتدا اس کیفیت سے ہو۔ شام کا وقت لیکن شفق سے شرابور، آدھر سورج ڈوب رہا تھا اور ادھر ایک بدرِ کامل طلوع کر رہا تھا، اس کی چارنی سمت کر ایک نقطہ میں تبدیل ہوئی اور پھر پھر کرتا نظر میں، آپ کو شاید یہ معلوم ہو گا کہ اس ترکیب سے جو پیکان طیار ہوتا ہے وہ اکت کر صاحبِ ترکش کو بھی مجروح کر دیتا ہے۔ یہ جرات نام ہے اس تبسم کا جو ہونٹوں پر نہیں بلکہ چٹوٹوں پر نمایاں ہوتا ہے۔ مجھے اس کا ہوش اس وقت ہوا جب ساحلِ قلاب کی تاریکی میں صرف ایک ہی روشنی جگمگا رہی تھی۔ کہاں؟ میرے پہلو میں میری آغوش میں، میری نگاہ کے سامنے میرے لبوں سے نزدیک اور میری روح کے اندر۔ طلوع و غروب کا مفہوم بدل کر اب صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ "ہیں" اور "نہیں" ہیں، لذت و الم کے حقیقی فلسفہ کا راز منکشف ہو گیا اور اس طرح کہ میں اُن سے دور ہوں یا نزدیک ہوں۔ ہائے وہ رات جس کی صبح کا مفہوم میرے لئے سوا اس کے کچھ نہ تھا کہ "بوسے یا سمن باقی است"۔ میرے لئے قائم ہو کر رہ گئی ہے، میں نے یا کسی اور نے زمین سے اس کی گردش سلب کر لی ہے۔ ہیئت کے نظام کو بدل دیا ہے اور گرمی کی وہ پہر کا آفتاب بھی مجھ پر چاند کی خشک شعاعیں ڈالتا ہوا نظر آتا ہے۔ "حکم برستارہ کنم" تو نہایت ضعیف سی بات ہے، یہاں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میری محکوم ہے اور اگر میں برہم ہو جاؤں تو شاید خدا ساری دنیا سے بیزار ہو کر منہ موڑ لے۔ فرصت ہو تو آئیے اور دیکھ لیجئے کہ خلیفۃ اللہ فی الارض، زمین پر کیا آفتیں ڈھا رہا ہے۔

دیکھئے

سالنامہ ۱۹۳۲ء کے لئے چھ آنے کے ٹکٹ بھیجنا نہ بھول جائیے۔ ورنہ ہم اس کے محفوظ سپونجے کے ذمہ دار نہ ہوں گے اور اس کے گم ہو جانے کی صورت میں دوبارہ ہم اسے مفت فراہم نہ کر سکیں گے۔

منہج

اکبر الہ آبادی

انیسویں صدی میں اردو شاعری کافی ترقی کر چکی تھی۔ ہر چہ "اس کے اقتدار کے مقابلہ میں گاہ گاہ اکھڑا ہوتا تھا۔ پر دہلی کی زبان معیاری زبان کی حیثیت سے مافی ہولی تھی۔ اس کی نوعمری میں دکن کے اس پرورش کی تھی۔ مگر اب وہ چلتا ہوا مرکز نہ رہا تھا۔ اکثر اہل قلم دہلی اور لکھنؤ ہی میں اپنی ترقی کے سامان پارہے تھے۔ اس میں سے محدودے چند دربار حیدر آباد کی طرف ہجرت کر گئے تھے اور وہاں کی سرپرستی حاصل کر پائے تھے۔ لیکن وہ وہاں رس بس نہ پائے اور وہ ہمیشہ اپنی متمنی نگاہیں شمال کی طرف ہی ڈالتے رہے۔ اردو ایک شستہ و شایستہ زبان بن چکی تھی۔ اس کا ابتدائی اکھڑا ہوا دور چکا تھا مگر اس راہ میں اس کی توانائی گھٹ گئی تھی۔ تازگی اور قوت کھو جانے سے اس کے اسالیب پر تکلف اور بندھے ٹکے ہو کر رہ گئے تھے تشبیہیں اور استعارے بس ایک مخصوص قماش کی پیروی کرتے تھے۔ ہندوستانی اصل کے الفاظ بڑی سختی سے ترک کیے جا رہے تھے۔ دہلی۔ لکھنؤ اور حیدر آباد کے درباروں کی پروردہ شاعری کا بیشتر حصہ باوجود اعلیٰ صنعتوں کے سستا اور ادھما تھا۔ سادہ پر جوش ہونے کی بجائے جذبات ہوس پرستانہ تھے۔ اس عہد کی زوال پذیر سماجی زندگی پورے طور پر شاعری میں منعکس ہے۔

بھر بھی یہ بڑی قابل لحاظ بات ہے کہ تمیر، سودا، ذوق، غالب، آتش، ناسخ، درد، داغ اور انیس نے صحیح معنوں میں اعلیٰ شاعری نیا خون کا کتنا بڑا ذخیرہ پیدا کیا۔ نغمہ سرا چڑیوں کے اس نشین میں اور بھی ممتاز گانے والے تھے۔ لیکن وقت آگیا تھا۔ جس درود میں نیا خون داخل کیا جائے۔ حالی اور اکبر دوسروں سے زیادہ اس تبدیلی کے ذمہ دار تھے جو اردو کے معنی و صورت میں رونما ہوئی۔ جب ۱۸۷۷ء میں حالی نے مندرجہ ذیل اشعار لکھے۔ تو وہ نئی طرز میں نئی بات کہہ رہے تھے:

اے وطن! اے مرے بہشت بریں کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں

تیری اک مشت خاک کے بدلے اوں نہ ہرگز اگر بہشت سے

لیکن یہ اکبر کی تقدیر میں تھا کہ وہ اردو شاعری کے مواد اور مزاج میں ایسی تبدیلی پیدا کریں جو گویا انقلابی تھی۔

پیدائش اور خاندان سید اکبر حسین، باڑا ضلع الہ آباد میں ۱۶ نومبر ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا کے ابتدائی وطن نیشاپور ایران تھا ان کے پردادا فوج میں صوبہ دار تھے۔ انھوں نے جنگ پلاسی میں حصہ لیا تھا۔ ان کے دادا سید فضل محمد عالم تھے۔ انھیں اردو کے نواب آصف الدولہ سے جاگیر ملی تھی۔ ان کے والد سید فضل حسین نے نائب تحصیلدار کی تک ترقی حاصل کی اور ۱۸۹۹ء میں وفات پائی۔ ان کی والدہ صوبہ بہار کے ضلع کیم کی رہنے والی تھیں۔

اس عہد کے متوسط طبقے کے نمائندہ گھرانے کے نوجوانوں کی طرح اکبر نے فارسی اور عربی پڑھی لیکن وہ انگریزی کی جانب بھی کھینچے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب شروع شروع انگریزی ہندوستان میں رواج پانے لگی تو مسیحی جماعت مسلمانوں نے اس کو دوس سے کنارہ کشی کی۔ تا آنکہ سر سید احمد خاں سامنے آئے اور ان کی کوششوں کے نتیجے میں مسلمانوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اب انگریزی تعلیم کے فائدوں سے متمتع ہوں گے۔ اکبر کو تمام عمر ایسے نظام تعلیم سے گہری بے اعتمادی رہی۔ جس کو علی روایات سے دور کا تعلق بھی نہ تھا۔

بے اعتمادی ان کے اشعار سے مستقل طور پر ظاہر ہوتی رہی۔ ۱۸۹۷ء میں وہ نائب تحصیلدار مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۷ء میں انھوں نے پلیڈری کا آخری امتحان پاس کیا۔ اور کچھ عرصہ تک وکالت کرتے رہے۔ ۱۸۹۷ء میں وہ ملازمت عدلیہ میں منصف کی حیثیت سے لے گئے۔ وہ ترقی کر کے

ضلع جے پے اور بہار زمست سے سبکدوش ہو کر الہ آباد میں بس گئے۔ عشرت منزل میں رہتے تھے انھوں نے ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ۷۷ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے زندہ رہ جانے والے لڑکے سید عشرت حسین جو ضلع کلکتہ کے عہدہ تک پہنچ کر ریٹائر ہوئے تھے۔ چند سال قبل انتقال فرما گئے۔ عشرت کے لڑکے عقیل اور مسلم جو دونوں میرے سابق شاگرد تھے۔ دونوں پاکستان میں ہیں۔ اکبر کی تدفین خسرو باغ کے قریب لاڈلڈا میں ہوئی تھی۔ ان کے مقبرہ میں مندرجہ ذیل شعر کندہ ہے:-

قبر میں آئی تجلی روئے جاناں کی مجھے زہر سمجھے تھے جسے وہ شربت دیدار تھا
 شخصی لحاظ سے اکبر اتنے ہی دلچسپ تھے جتنے کہ وہ شاعر کی حیثیت سے تھے۔ ان کی صحبت میں بے کیفی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ نہایت ہی دلنوازا اور جوش آفریں گفتگو کرنے والے تھے۔ لطیفے پر لطیفے سناتے جاتے۔ اشخاص و واقعات کے متعلق عیارانہ اشارات کئے جاتے۔ یاد ایام کی باتیں ہوتی تھیں، چٹکے، زندگی پر امان کہاوتیں، اقوال اور فی البدیہہ اشعار پیش کئے جاتے تھے۔ ان کی گفتگو شراب و کباب کی طوج ہوتی تھی۔ نغمہ خیز اور مقوی۔ مجھے کسی بار انھیں دیکھنے کا فخر حاصل ہوا۔ لیکن میں صرف دو بار دو محترم دوستوں کے ساتھ ان سے ملنے ان کے گھر پر حاضر ہوا۔ افسوس! یہ دونوں حضرات سٹرکچار اور مولوی نصیر الدین انتقال فرما چکے۔ وہ ہم سے بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے وہ ان دنوں اپنے بیٹے سے ملنے پرتاب گڑھ گئے تھے۔ اس ملاقات کا مفصل طور پر ذکر کرتے رہے۔ اور ہم لوگوں کو ایک گفتگو تک اپنی باتوں سے مسحور رکھا۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کے آخری سال میں تھے۔ لیکن ان کی گفتگو کی جاندار سی اور ولولہ سے آنے والے انجام کا ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا تھا۔ ہم نے پوچھا کہ پرتاب گڑھ کے لوگوں نے آپ کا دھوم دھام سے خیر مقدم کیا ہوگا۔ جواب ملا

”ایک دفعہ خدا نے لندن کی سیر کی۔ دن بھر وہ سرگرداں رہے۔ گلی گلی کی خاک چھانی۔ در بدر دستک دیتے پھرے لیکن ڈپٹی صاحب کے والد وہ دھکے دے کر نکال دئے گئے۔ کسی نے پانی بھی ان کو چہنچہ کو نہ دیا اور بھوکے آخرش وہ ایک مکان پر پہنچے اور لوگوں کو بتلایا کہ وہ خدا ہیں۔ پھر انھوں نے ایک گلاس پینے کو پانی مانگا۔ لیکن یہ بات رد کر دی گئی۔ پھر وہ ادھر ادھر جھٹکنے پر مجبور ہوئے تھکے مارے وہ ایک مکان میں جا داخل ہوئے۔ انھیں شدت سے پیاس لگی۔ فرمایا میں یسوع مسیح کا باپ ہوں۔ یہ سن کر گھر کے مالک نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اور خاطر تواضع کی بارش سے انھیں ششدر کر دیا۔“

بھائی! پرتاب گڑھ میں کسی نے اکبر کی طرف بھوئی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھا۔ لیکن ڈپٹی صاحب کے والد کی بڑی قدیم ہوئی یہ ہماری اکبر الہ آبادی سے گفتگو کا محض ایک ٹکڑا تھا جو میرے حافظے میں باقی رہ گیا۔ اسی وقت انھوں نے ایک شعر کہا۔ اور ہمیں سنایا۔ ملاحظہ ہو:-

میں کسی چیز کا نہیں عادی ایک عادت ہے سائنس لینے کی

ایک دن کوئی نوجوان شاعر ان سے ملے گیا۔ فرمایا:-

تختہ شب برات کیا بھیجوں؟ تم تو ابے جان خود پٹاخہ ہو

اکبر نے روایتی انداز میں بہت غزلیں لکھی ہیں۔ جن میں اردو دنیا کے معروف عشقیدہ تجربے پیش کئے گئے ہیں۔ آرزوئے ناکام۔ گریز محبوب رقیب پر عمر و نیاں پروانے کا شمع سے لگاؤ، بہار میں قیدِ قفس کی سختیاں غمِ نجات کے لئے ساقی کی نوازشیں۔ حسن کا فیر اور مسجد کی خانہ دیرانی، واعظ کی حقائق وغیرہ وغیرہ۔ غرض:- کہ یہی گھسے پٹے ہوئے استعارات اور علامتیں جنہیں ہر شیت میں نئی زندگی مل جاتی ہے۔ اکبر نے بھی برقی ہیں۔ مثلاً جس نے اکبر کی تفریحی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر اکبر کی کاوش کا نتیجہ تسلیم نہیں کرے گا:-

جو ذبح کرنا ہے پر کھول دے مرے صیاد کر رہ نہ جائے ترپنے کی آرزو باقی

ذیل میں چند اور اشعار درج ہیں۔ جن میں تغزل کا رنگ بہت نمایاں ہے:-

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

مریض محبت ترا مر گیا خدا کی طرف سے دعا ہو گئی

ان کا گھر چھوڑ کر کہاں جاؤں ، دل ہی کے ساتھ میں ٹھہرتا ہوں
یہ ارشاد آپ کا بالکل بجائے حضرت واعظ
آئی ہوگی کسی کو بھر میں موت ، مجھ کو تو نیند بھی نہیں آتی !
کوئی اکبر سادہ دواز بھی نظر آیا ہے کم ، یہوں رہتا ہے جو پوچھو تو سبب کچھ بھی نہیں
ہر چند کہ اس طرز کے اشعار روایتی انداز میں لکھے گئے ہیں ۔ تاہم ان میں وہ تازگی ہے جو ان کے ہم عصروں کے پرنسٹن کلام میں مفقود ہے
کلام منظوم کی فن کاری میں اکبر نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے ۔ وہ غیر ملکی الفاظ اور اسمائے خاص کو بھی قافیہ میں نہایت مکمل طور پر برتتے
ہیں ۔ میں نے ایک ایسا شعر سنا ہے جو کسی مجموعے میں نہیں ملتا ۔
کسی نے اکبر سے فرمائش کی کہ وہ کوئی ایسا شعر لکھیں جس میں مسٹر کچھو کا قافیہ ہو ۔ فی البدیہہ مندرجہ ذیل شعر وارد ہوا :
کوئی جا کے کہہ دو کچھ دوسے ، ہم سب ہو گئے ہیں زچہ دوسے
اس طرز کے طبع آزمائی کے بہت سے نمونے ملتے ہیں :
چمکڑے پوجو چڑھتے تھے ، ہیں موٹر پر سوار آج
کیوں اس کو سمجھتے نہیں تم لوگ سدا راج

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا ، حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
مذہب کا اثر اکبر کو ہمیشہ سے دکھ رہا ۔ کہ سماج پر مذہب کا اثر کم سے کم ہوتا جاتا ہے ۔ وہ مادی اور سائنٹفک ترقی کے خلاف نہیں تھے بلکہ
روحانی اعتقاد کے نہ ہونے پر غور میں کرتے تھے ۔ وہ رجعت پسند نہیں تھے ۔ اگرچہ ان کے بعض اشعار سے یہ بات ظاہر ہوتی
ہے ۔ انھیں سائنس کے فوائد تسلیم تھے ۔ لیکن وہ مذہبی غویوں پر زور دیتے تھے ۔ وہ اسلام کے معتقد تھے ۔ وہ تشدد نہیں تھے ۔ وہ یہ مانتے
تھے کہ دوسرے مذاہب کو بھی قائم رہنا اور بچھلنے پھولنے کا حق حاصل ہے ۔ اپنے بعض اشعار میں وہ سرسید احمد خاں اور ان کے تعلیمی پروگرام پر
کڑی نکتہ چینی کرتے ہیں ۔ اکبر حیدری مرحوم کے در دولت پر ہونے والی ایک گفتگو مجھے اس سلسلہ میں یاد آتی ہے ۔ انھوں نے مجھے اور ڈاکٹر
ضیاء الدین کو کھانے پر بلایا تھا ۔ برسمین تذکرہ سر حیدری نے پوچھا کہ ”ضیاء الدین ! مجھے بتاؤ تو بھلا علی گڑھ تحریک سے مسلمانوں اور ہندوؤں
کے اختلافات بڑھ نہیں گئے ؟“ ڈاکٹر ضیاء الدین خاموش رہے ۔ مگر وہ نمایاں طور پر پریشان خاطر تھے ۔ بہر کیف اکبر طلبہ کالج پر عموماً
اور طلبہ کے علی گڑھ پر خصوصاً فقرے کہنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے ۔ کیونکہ انھوں نے اپنی قومی تہذیب کو ترک کیا تھا ۔

ڈارون صاحب حقیقت سے نہایت دوستی
میں نہ مانوں گا کہ مورث آپ کے منگور تھے
صاحبزادے نشہ میں ہیں اور بیچ کنواری کی ہے نفن
ہیں مولوی صاحب بھی چپا در پٹت جی بہلاج بھی چپ
یہ میرے سامنے شیخ و برہمن کیا جھگڑتے ہیں
اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہوں دونوں کا قایل ہوں
حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانہ میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں
یورپ والے جو چاہیں دل میں بھروسہ دیں
جس کے سر پر وہ چاہیں تخت و سہر دیں
بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبر
تم تو کیا ہو ؟ خدا کے تین ٹکڑے کر دیں
شری پدرس ناتھ سنہا کی کتاب میں بہت سے اشعار گاندھی جی کے متعلق ہیں اور ہندی جھگڑے کے بارے میں اور بہتر سے ہندو مسلم
اتحاد سے متعلق ذیل میں گاندھی جی سے متعلق دو شعروں نے جاتے ہیں :-

ایسے دشمن نصیب ہوں کس کو
یوں مبارک حضور کو گاندھی
اور کھسک جاؤں جب کہوں کھس کو
کہ ہیں خوب اور سر نہ اٹھائیں

میں نے ختم کلام کے لئے اکبر کی شاعری کا وہ حصہ چھوڑ رکھا تھا جو اس کا بہترین نمائندہ ہے۔ یعنی طنز و طراوت۔ یہ تیز اور کٹیلی ہے۔ مگر اس سے زخم نہیں لگتا۔ اس کی زوہر آہوا شکار عملاً اٹھتا ہے۔ لیکن اس کا مقصد تربیت اور ترقی ہے۔ نفرت و عداوت کا زہر اس میں نام کو نہیں ملاج لطیف اس زہر کا مداوا بن جاتا ہے۔

مثالیں تو بھری پڑی ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم۔ تیز کی گراوٹ۔ مغرب کی غلامانہ نقالی۔ شہرت کی ہوس، کم علمی کا عجب و تکبر۔ روایات سے بے خبری وغیرہ ان کے ہوتے ہیں۔ ان اشعار میں اس دور کی مصوری ہے، جو اب گزر گیا۔ مثلاً برطانی افسروں کا رعب و اب۔ چھاؤنیوں کی زندگی و سیٹوران میں یورپی کھانوں کی طرف رغبت۔ خطابات کا ضبط۔ سرکاری فوازشات کا جنون۔ یہ نمونے نہایت قیمتی ہیں۔ کیونکہ ان سے ہماری تواریخ کے ایک دہرے روشنی پڑتی ہے۔ ان میں غورو فکر کے لئے بڑا مواد ہے۔

کیوں سول سرجن کا آثار دکتا ہے ہم نشیں
ہوئے اس قدر جہذب، کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
چور کے بھائی گھر کٹ تو سنا کرتے تھے
برق کے ٹیمپ سے آنکھوں کو بچائے اندر
ریٹ ری کو کر لیا جب قوم کے سر نے قبول
تھی بہت ان کو مسلمانوں کی تہذیب کی فکر
اس میں ہے اک بات آخر کی شفا ہو یا نہ ہو
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر
اب یہ سنتے ہیں اڈیٹر کے برادر لیڈر
روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے
دخل انگریزی پر اردو کی شکایت ہو فضول
بولے مسجد کے تنے مٹے کا بھی سامان رہے

الہ آباد نے بڑے بڑے ماہرین سیاست، جج، قانون دان اور اہل تدبیر پیدا کئے ہیں، زمانہ قدیم سے یہ علم کا مرکز رہا ہے، لیکن محو حاضر کے ہندوستانی ادب میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ اکبر ہے، ہمیں ان کی یاد دینے سے نگار کھنی چاہئے۔

ڈاکٹر امر ناتھ جھا

(الہ آباد میں یوم اکبر کے موقع پر پڑھا گیا)

علاقائی دفتر

تصانیف نیاز فختوری

عاجزی نصب

من ویز داں کامل — مذہبی استفسارات و جوابات — جمالستان — نگارستان — شہوانیات —
مکتوبات نیاز تن حصہ — انتقادیات — حسن کی عیاریاں — مالہ و ما علیہ — شہاب کی سرگزشت —
فلاسفہ قدیم — مذاکرات نیاز — فراست الید — مذہب — نقاب اٹھ جانے کے بعد —

میزان

۱۹۵۷ء

تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر مودہ محصول صرف چالیس روپے میں اخیر جنوری ۱۹۵۷ء تک

مینجر نگار لکھنؤ

جہنم

(ملٹن کا ایک شاہکار)

پہلا سین — اہلیس کی تقریر

تورات کی روایت ہے کہ اہلیس اور اس کے ساتھیوں نے خداوند عالم کے ساتھ بغاوت کی مگر ناکام رہا۔ خداوند عالم کی فوجوں نے باغیوں کو ہرا کر جہنم میں جھونک دیا۔ جہنم میں جملہ شیاطین پر غفلت اور غنودگی چھا گئی۔ سب سے پہلے اہلیس کو ہوش آیا اور وہ کھڑا ہو گیا۔ بلند بالا، سرور قد، جوان، خوبصورت، چہرہ پر وہ نور کہ چودھویں کا چاند شمس اور دلیری کا یہ رنگ کہ اس کا ثانی تلاش کریں تو نہ پائیں، کھیلا، چہرہ پر ابدن، کھیلا نقشہ نشیل آنکھیں، دانے ہاتھ میں تلوار، بائیں میں نیزہ، سر پر تاج، مدبر، فیسوف، سپا و سالار۔

وہ کھڑا ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ سیاہ بھیانک آگ۔ آگ کی لپٹوں میں روشنی نہ تھی، اندھیرا تھا۔ ہر طرف مایوسی و محرومی و ناکامی و نامرادی کی شکلیں نظر آتی تھیں اور آگ کے سمندر میں شیاطین یوں تیر رہے تھے جیسے آسمان پر تارے۔

وہ آگ کی موجوں کو چیرتا ہوا ایک قریبی ٹاپو کی طرف بڑھا۔ پہلے تو اپنے مضبوط بازوؤں سے بہتی ہوئی آگ پر تیرتا رہا۔ پھر نضا میں اڑنے لگا جیسے فرشتے اڑا کرتے ہیں۔ اس کے بے چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کی رفتار بجلی سے تیز تھی۔ وہ جہنمی ٹاپو کے آتش فشاں پہاڑ کی دہلیزی ہوئی چوٹی پر کھڑے ہو کر اوپر کی طرف دیکھنے لگا، اس کی تیز نظر آسمانوں کے پردوں کو چیرتی ہوئی۔ فردوس بریں کے باغ میں پہنچی۔ وہاں بھی عظیم الشان فتح کی خوشی میں تاج رنگ کی مجلس گرم تھی اور حوروں کے گانے کی آواز آرہی تھی۔

تری شان جل جلالہ - تری ذات عم نوالہ

ترا حسن لیس مشالہ - تو عظیم ہے تو قدیم ہے

یہ ترا ہی نور ہے سوسو - یہ ترا ہی روپ ہے رو برو

یہ ترا ہی رنگ ہے ہو ہو - تو غفور ہے تو رحیم ہے

تو خدا ہے حسن و جمال ہے - تو الہ جل و جلال ہے

تو کمال اوج کمال ہے - تو حکیم ہے تو کریم ہے

ترا کلمہ پڑھتی ہیں طوطیاں - ترا نام لیتی ہیں بھلیاں

ترا غلغلہ ہے جہاں تہاں - تو علیم ہے تو فہیم ہے

وہ زور سے چلایا :

اے جہنم! — اے آسمانوں! — اے فردوس کی خوشبو! — اے عرش کی عظمت! — الفراق، الوداع، الوداع —

اور اے جہنم! — اے جہنموں کی بستیو! — اے جہنموں کی مصیبتو!، تکلیفو!، مرجبا، مرجبا، آؤ، اٹھو، اپنے نئے مہمانوں کا استقبال کرو،

آنکھیں بھپاؤ، دل و جان قربان کرو۔ آج تمہارے یہاں وہ عظیم المرتبت ہستیاں تشریف لائی ہیں، جن کا ہم پائے وہم رتبہ نہ کوئی آسمانوں میں

ہے، نہ جنتوں میں، نہ ارواح میں، نہ اجالی میں، نہ لاہوت میں، نہ ناسوت میں، نہ وجوب میں، نہ امکان میں۔

(اس کا دل دھڑکنے لگا، آواز رک گئی، لب بند ہو گئے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی انتہائی غفلت و درہوشی دیکھ کر دم بخود رہ گیا
آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دیر تک خاموش کھڑا چاروں طرف دیکھتا رہا۔ پھر یکایک زور زور سے پکارنے لگا)

اے قدوسیو! معظّم قدوسیو! محترم فرشتو! مکرم شہزادو! اٹھو! کھڑے ہو جاؤ!

اے آسمانوں کی پاک رُو! اے طلاءِ اعلیٰ کے چمکے ستارو! اے عظمت کے پہاڑو! نور کے سمندر و آبِ روشنی کے مسقونو! —
غفلت، سستی، بے ہوشی، بے حسی، آسمانوں کی غلام رُوؤں کے حوالے کر دو، اٹھو، کھڑے ہو جاؤ!

(معاذِ شیطاں کروڑوں پریموں کی تعداد میں جلتے ہوئے ٹاپو میں اس کے گرداگرد جمع ہو گئے اور سب کے سچے بیچ وہ خود
کھڑا تھا جیسے تاروں کے جھرمٹ میں چاند)

آہ! کیسی غفلت ہم پر چھا گئی تھی! حیرت میں ہوں یہ کس چیز نے ہمیں غافل کر دیا تھا! وہ پاک ہستیاں جو غلامی کی ملعون زنجیروں
سے آزاد ہو چکی ہوں اور خود داری و آزادی کے جھنڈے ہاتھوں میں لئے ہوں، کیا غفلت و بے ہوشی کا شکار ہو سکتی ہیں! وہ نورانی پیکر جن کے
زریں کارنامے صفحہ ہستی پر ابد تک قائم رہنے والے ہوں، کیا غلامی و بے بسی کی زندگی پر قناعت کر سکتے ہیں!

قسم ہے اس مقدس کموار کی، اور اس متبرک نیزے کی اور اس عظمت و جبروت کے تاج کی جو میرے سر پر چمک رہا ہے۔ کہ ہم غلام نہیں
ہو سکتے۔ طلاءِ اعلیٰ کی نام بھولنا کہ قوتیں سرگرم کرنا ہو جائیں گی مگر ہم میں کے ایک فرد کو بھی غلام نہیں بنا سکیں گی۔

(تالیاں بجن)

معظّم قدوسیو! — یہ جہنم اور تم جہنم میں ہو! — آگ ہے اور تم آگ میں ہو! — مگر تم جہنم کے بادشاہ ہو، کروٹ مار کے فرمانروا ہو،
آزاد و خود مختار ہو۔ تم ننھی کھوپڑی والے جھمبیل اور چوڑے کانوں والے میکاٹل نہیں ہو۔ وہ غلام بھیڑیں ہیں، تم آزاد خیر ہو شیراز، شیریں ہو۔
کون ہے جو آزادی کا علمبردار نہیں ہے، کون ہے جو غلامی پسند کرتا ہے۔ اگر کوئی غلام بننا چاہتا ہے تو آگے بڑھے، میں اسے غلاموں کی
جنت میں ڈھکیں دوں کہ وہاں شوق سے عرش کے پتھروں پر اپنی پیشانی رگڑا کرے، گڑگڑایا کرے اور مرا کرے

(کوئی نہیں، کوئی نہیں کی آوازیں)

کیا یہ گڑگڑانا اور رونا اور معافی مانگنا اور عاجزی کرنا، ذلت کی انتہا اور رسوائی کی تحت الشری نہیں ہے، یہ کام ہم سے کبھی نہ ہوگا،
کبھی نہ ہوگا۔

معظّم قدوسیو! — کیا یہ جہنم ہے؟ کیا واقعی جہنم ہے؟ نہیں نہیں — یہ جہنم نہیں ہے۔ قسم ہے تمہارے عظمت و جلال کی یہ جہنم
نہیں ہے — ہمارے لئے یہ جہنم نہیں ہے۔ غلام رُوؤں کے لئے جہنم ہے۔ سر جھکانے والی اور ماتھا ٹیکنے والی کٹ تیلیوں کے لئے جہنم ہے۔
ہمارے لئے یہ جہنم جنت ہے اور جنت جہنم ہے۔ ہمارے لئے یہ آزاد جہنم ایک نہیں ستر ہزار جنتوں سے ستر ہزار درجے اعلیٰ و ادنیٰ ارفع
و افضل ہے۔

وَلَا لَآخِرَةَ الْكِبَرِ وَرَجَبِ الْكِبَرِ تَفْصِيلًا

جنت اور جہنم کا بنانا اور بگاڑنا تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ہم جب چاہیں جنت کو جہنم اور جہنم کو جنت بنا سکتے ہیں۔ دوستو! — یہ جنت
اور جہنم کیا ہے؟ — ایک زاویہ شکاہ ہے۔ ایک حلقہ خیال ہے۔ ایک گوشہ تصور ہے اور بس۔

کوئی عظیم دیوتا ہمیں اس جہنم سے محال نہیں سکتا۔ موت ہمیں جہنم نہیں سکتی، ہماری ہستی لازوال ہے، ہماری روح غیر فانی ہے۔ ہم ہمیشہ
ہمیشہ زندہ اور ہمیشہ ہمیشہ قائم رہیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ اس دیوتا سے بڑے ہیں گے جو آزادوں کو غلام بناتا ہے اور غلاموں کو ذلیل کرتا ہے، کیا یہ
مقدس ہیں وہ ہستیاں جو اس کی بندگی سے آزاد اور اس کی محتاجی سے مستغنی ہیں!

(چاروں طرف سے مرجہا مرجہا کا وہ شور اٹھا کہ عرش برس کے قدم کی دیواریں ہلنے لگیں)

کرم فرشتو! — اس میں شک نہیں کہ ہمارے دشمن کی مادی طاقت ہم سے زیادہ ہے اور اسی وجہ سے اس نے ہمیں تیر و تفلک کی لڑائی میں ہرا کر جہنم میں ڈھکیل دیا ہے مگر کیا ہوا؟ — ہم نے کچھ ہتھیار نہیں رکھ رکھے! اپنی بار تسلیم نہیں کی! — ہم قیامت تک ہتھیار نہیں رکھیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ لڑتے رہیں گے۔ پہلے آسمانوں اور جنتوں کی بلند یوں پر لڑتے تھے۔ اب زمینوں اور جہنموں کی پستیوں میں لڑیں گے اور ظاہر ہے کہ یہ نیا محاذ جنگ ہمارے حق میں زیادہ مفید ہے۔

ہم اپنی قوت کا بھی امتحان کر چکے اور دشمن کی قوت کا بھی لہذا اب جو لڑائی ہوگی خواہ وہ تیر و تفسنگ کی لڑائی ہو یا فریب و دجل کی میدان ہمارے ہاتھ رہے گا کیونکہ ہمارا تجربہ پہلے سے کہیں زیادہ ہے اور ہماری قوت میں بال برابر بھی کمی نہیں ہوئی۔ ہم ہرگز ہرگز چین نہیں لیں گے جنگ عرش و فرش پر ہماری حکومت قائم نہ ہو جائے اور جب تک تمام سر جھکانے والی قوتوں کا قلع قمع نہ کر ڈالیں۔ یہ بات تو مسلم ہے کہ ہم غلامی نہیں کر سکتے کسی قسم کی غلامی نہیں کر سکتے اور اگر ہم یوں ہی خاموش پڑے رہیں تو یہ بھی ایک طرح سے اس عرش والے دیوتا کی خوشی ہوگی جس کے سامنے ہم نے اپنی گردنیں جھکا دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اور جس کی ہر آن مخالفت و مقادمت ہماری زندگی کا وحید مقصد ہے۔

دلیرو! — پیادرو! — بتاؤ، کیا کرتا چاہئے اور آسمانی قوتوں سے کیونکر لڑنا چاہئے؟

اے ہمت و شجاعت کے قافلہ سالارو! اے علاو اعلیٰ کے معزز مہر اداو! اے قدوسیو کے استادو! ملائکہ کے آقاو! تمہاری ہمت پر مرجہا، تمہاری شجاعت پر آفرس اور تمہاری دلیری پر عرش و فرش، سدرہ و کمرسی، برزخ و جنت، آسمان و زمین اور ہر وہ چیز جو آسمانوں کے اوپر ہے اور زمینوں کے نیچے ہے اور آسمانوں اور زمینوں کے درمیان ہے قربان کی جاسکتی ہے۔

قسم ہے تمہارے مضبوط سینوں اور فولادی بازوؤں کی کہ تمہاری بے نظیر اور بے بدل اولوالعزمیوں کے آگے فردوس کے کنگورے اور عرش کی ہرجیاں سرنگوں و شرمسار ہیں۔ مگر جلدی نہ کرو، یہ جلدی کا نھل نہیں غور و فکر کرو کہ کیا کرنا چاہئے؟ — علانیہ جنگ کرنی چاہئے یا خفیہ جنگ؟ — بازوؤں کی قوت کے جوہر دکھانے چاہئیں یا دماغی قوت کے؟

مجھے خبر ملی ہے کہ عرش والے دیوتا نے نظام حکومت کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے ہیں اور وہ اپنے بیٹے مسیح کو ہمارے مقابلہ میں بھیجے والا ہے۔ مگر قسم ہے تمھاری تلواروں کے جو ہر کی کہ ہم اس نئے نظام حکومت کے بھی پڑاچھے اڑا ڈالیں گے۔ اور مشرق سے مغرب تک کھلی بغاوت پھیلادیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم غفلت نہ کریں اور غور کریں کہ کیا کرنا چاہئے اور کیونکر کرنا چاہئے؟ ایک عظیم الشان کانفرنس ہو اور اس میں موجودہ مسائل کے ہر پہلو پر غور کیا جائے۔۔۔۔۔

بے علم بول — ”ضرور، ضرور، قدر سیو! چلو آؤ کا نفرش کے لئے خیمہ نصب کریں“

(پردہ گر جاتا ہے)

دوسرا سین — ”کانفرنس“

بعلم ہول نے منتر پڑھنا شروع کیا۔ اس کے زور سے جہنمی کوہ آتش فشاں کی دیواریں پھٹنے لگیں اور ان میں سے گچھے ہوئے سونے کے چٹھے اُبلنے لگے۔ اسی سونے سے خود بخود ایک عظیم الشان محل طیار ہو گیا اور یہ شیطانی کانفرنس کا محل باغ عدن کے برابر لمبا اور باغ فردوس کے برابر چڑا تھا۔

پھر اس نے دوسرا منتر پڑھا تو آگ کے سمندر میں سے مہیرے، یا قوت اور زبرد کے ترشے ہوئے گولے خواہوں کی طرح اڑنے لگے اور اسی محل میں بھلنہ پل کے اشارے سے خود بخود پیوست ہوتے چلے گئے۔ انہی موتیوں سے اس سونے کے محل کی آرائش ہو گئی۔

بعلزبول کو آسمان پر معمار اعظم کا لقب حاصل تھا۔ جنت کی تمام بہترین عمارتیں اس کے دماغ کی اختراع اور اسی کی صناعتی کا نتیجہ ہیں۔ جب خداوند عالم کے حکم سے اس معمار اعظم نے عرش معلیٰ کے پرانے گنبد اور مینار نئے طریقے پر بنائے تو اسے اپنی کاریگری پر بڑا گھمنڈ ہو گیا اور سمجھنے لگا کہ بچوں میں دیگرے نیست۔ اور یہ نہ سمجھا کہ مجھ میں جو کچھ بھی طاقت ہے اسی پروردگار کی دی ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے خداوند عالم نے اس پر لعنت کی اور دوسرے شیطانوں کے ساتھ اسے بھی جہنم میں ڈھکیل دیا۔

جب کانفرنس کے لئے سونے کا شاندار محل طیارہ چکا تو بعلزبول نے محل کے اندر عرش کے نمونے کا ایک تخت بنایا جس پر ستر ہزار یا قوتی کرسیاں نصب کیں اور بچوں بیچ ابلیس کے لئے ایک ہیرے کا معلق شہ نشین قائم کیا۔

جلسہ شروع ہوا۔ کرسیوں پر وہی شیاطین بیٹھے جنہیں آسمان پر معزز القاب حاصل تھے۔ باقی ماندہ شیطانوں نے اپنا جسم چھوٹا کر کے ننھے ننھے جگنوؤں کی شکل میں تبدیل کر لیا اور تخت کے چاروں طرف پرے باندرے ہوئے جگمگانے لگے۔ جگنوؤں کی کثرت سے سارا محل نورانی ہو گیا۔

ابلیس معلق شہ نشین پر جلوہ افروز ہوا اور یوں کہنے لگا :-

”اے علم و دانش کے خداوندو! آزادی کے دیوتاؤں! حریت کے پرستارو! معظم و مکرم و محترم فرشتو! سنو شہ نشین اور یہ تخت جس پر میں جلوہ آرا ہوں جنت کی راحتوں اور عرش کی رفعتوں کا تخت نہیں ہے۔ مصیبتوں اور بے چینیوں کا تخت ہے۔ پھولوں کی سیج نہیں ہے کانٹوں کا ڈھیر ہے۔ اس تخت پر جو سب سے اونچا ہے عرش والے دیوتا کے نزدیک وہی سب سے نیچا ہے۔ جو سب سے بلند ہے وہی سب سے پست ہے۔ مگر یہ بلندی و پستی محض ایک دھوکا ہے، قریب ہے، واپس ہے، سودا ہے، جنون ہے، بطلان حق و ابطال حقیقت ہے۔ ہم سب ایک ہیں اہم درجہ وہم رتبہ۔ یہاں نہ کوئی عزت ہے نہ ذلیل۔ نہ اونچا نہ نیچا۔ نہ بلند نہ پست۔ البتہ ہم آسمانی مخلوق سے ستر ہزار درجے بلند ہیں یا اسلئے کہ ہم آزاد ہیں اور آسمانی مخلوق ہم سے ستر ہزار درجے پست ہے یہ اس لئے کہ وہ غلام ہے۔

میں تمھارا وقت خیالی بحثوں میں ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اس وقت ہم اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ نئی جنگ کی تیاری کریں اور اس کے طریقوں پر غور کریں۔ جو شخص جو کچھ بھی مشورہ دے سکے کھڑا ہو جائے اور ہدایت کی روشنی پھیلانے۔

البیعال کی تقریر

ابلیس کے بیٹھے ہی البیعال کھڑا ہو گیا۔ پست ہمت، حیلہ جو، مفسد، فریبی، دغا باز، دور اندیش، زیرک، ذہین — وہ زور سے چلانے لگا :-

”خداوند ابلیس! علیک العزت والاکرام۔ خداوند جہنم۔ میں تمھیں آسمانی اعزاز کے القاب سے نہیں پکاروں گا۔ میری نظر میں تمام آسمانی القاب گرد و غبار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ تم آج سے خداوندان جہنم ہو، خداوندان سقر، خداوندان سعیر اور تم میں وہی سب سے زیادہ عزت و اکرام کا مستحق ہے جو عرش والے خداوند جنت کا سب سے بڑا دشمن ہے، سب سے بڑا باغی ہے۔ سب سے بڑا سرکش ہے! خداوندان سعیر! میں تمھیں عرش والے دیوتا سے کھلی جنگ کا مشورہ نہیں دوں گا۔ کیونکہ اب تک ہمارا بندہ آسمانی کوڑوں کی ضرب سے ڈکھ رہا ہے اور اب تک ہمارے حواس پر گزندہ ہیں۔ لہذا حالات حاضرہ میں علائقہ جنگ کی تیاری ہمارے حق میں مضر ہوگی۔ کیا عجب ہے کہ عرش والا دیوتا ہمیں ذلت کی زنجیروں میں جکڑ کر جہنم کے گندوں میں باندھ دے۔ اور ہم اتنی بھی رہی سہی آزادی کھو بیٹھیں۔“

”میرا مشورہ یہ ہے کہ مکر و فریب سے آگے بڑھنا چاہئے اور مکر و فریب سے دشمنوں کو زیر کرنا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ عرش والا دیوتا بھی خیر الما کرین ہے اور اس کا مکر بھی مکر اکبار ہے۔ مگر ہمارے مکر و شر کے آگے اس کا مکر ٹھہر نہیں سکتا اسی مکر و شر کی قوت سے ہم آسمان کی ایک تہائی فوجوں کو اپنے ساتھ ملا چکے ہیں۔ باقی دو تہائی فوجیں بھی اسی قوت سے ہمارے ساتھ آجائیں گی بشرطیکہ ہم مکر کی رسی کو مضبوط

پکڑ لیں اور دور اندیشی سے قدم بڑھائیں۔

جب آسمان کی ساری فوجیں ہمارے قبضہ میں آجائیں گی تو خداوند عرش اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر اعوان کی ہر فانی چوٹیوں پر چلا جائیگا اور خداوند ابلیس کو اپنی گدی پر تخت نشین کر دے گا۔

(زور کی تالیاں بھیں)

”یہ بات یقینی ہے اور ایسا ضرور ہوگا۔ ہم آسمان کے تمام فرشتوں کو عقل و حکمت اور قریب و دہل کے زور سے اپنا ساتھی بنالیں گے اور زمانہ شاہد ہے کہ قریب و دہل کا کوئی توڑ نہیں، یہ وہ زہر ہے جس کا کوئی تریاق نہیں۔ بس میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔“

ملوخ کی تقریر

ابلیس کے بیٹے بھی ملوخ کھڑا ہو گیا۔ دلیر غمخوار۔ غضب ناک۔ جنگ جو۔ پر رعب۔ خوفناک۔ کوتاہ فہم۔ عاقبت نا اندیش۔ نشان طراد۔ چلائے لگا۔

لڑائی۔ جنگ۔ کھلی لڑائی۔ کھلی جنگ۔

خداوند ابلیس و خداوندان کرام۔ ملائکہ عظام۔ شہزادگان و اشرار۔ فرمانروایان گرد و دھواں۔ جنگ۔ کھلی تیز اور علانیہ جنگ۔ لڑائی۔ تیروقتنگ کی لڑائی۔ گریز و شمشیر و تیغ و سناں کی لڑائی۔

گھوڑے کا سر عرش جسٹہ اہارا	بچے کا زناں میں ڈھکا ہمارا
ہلا دیں گے جنت کو نعرے ہمارے	آٹ دے گا دو رخ کو تیغا ہمارا
فرشتوں کے سرہار و سالار ہیں ہم	خداوند ابلیس آقا ہمارا
ہماری دلیری کے سگے بھے ہیں	دو عالم میں ہے بول بالا ہمارا
قدم و مہدم بجلیاں چومتی ہیں	قیامت ہے نقش کھٹ پا ہمارا
گرایا سر عرش روح الایں کو	کوئی آگے دیکھے کیجیا ہمارا
جہنم کے دیوار و در کا پتے ہیں	کہ اب معرکہ ہے خدا کا ہمارا
ڈرو عرش والو کہ پھر ہو رہا ہے	تمھاری طرف آج دھاوا ہمارا

زور کا کڑکا ہوا۔ سونے کے محل کی چھت شق ہو گئی۔ زلزلہ آگیا۔ آسمانوں کے پردے اٹھ گئے۔ عرش بے نقاب ہو گیا۔ تمام شیطانوں کی آنکھیں اوپر کی طرف اٹھ گئیں۔

تیسرا سین — خداوند عالم کا دربار

عرش

عرش معلیٰ کے قلعہ میں تمام ملائکہ کرام و کمر بیان عظام جمع ہیں۔ اور ابلیس کی فوجوں پر فتح مسین کی خوشیاں منائی جا رہی ہیں پیارے پیارے غلمان شراب مہوور کی ننھی ننھی پیالیاں ہاتھوں میں لئے ساقی بنے ہوئے فرشتوں کو پلا رہے ہیں۔ حوریں حمد کا ترانہ گارہی ہیں :-

حمد

ابھی مالک ہے تو بسکھوں کا زمیں بھی تیری زماں بھی تیرا
متاع حسن عیاں بھی تیری طلسم عشق نہاں بھی تیرا
تجھی سے ہے خیر و شر ہویدا بدی تجھی سے تجھی سے نیکی
تجھی سے تاروں میں ہے یہ گردش تجھی سے قائم ہے عرش و کرسی
ترے ہی در کے بھی گدا ہیں وہیں گے او پر فلک کے نیچے
تجھی سے جنت میں روشنی ہے تجھی سے دوزخ میں ہے اندھیرا
رحم بھی تو کریم بھی تو ازل بھی تیرا اب بھی تیرا
خود ہی بھی تو ہے خدا بھی تو ہے بھلا بھی تیرا بڑا بھی تیرا
چھپا بھی تو ہے کھلا بھی تو ہے عیاں بھی تیرا نہاں بھی تیرا

قلعہ کے بیچوں بیچ خداوند عالم کا گول تخت ہے تخت کے چاروں طرف ہر زمرہ دی پرستے پڑے ہیں جن کے اندر سے رحمت و نور کی شعاعیں
چھن چھن کر یوں نکل رہی ہیں جیسے موسلا دھار بارش ہو رہی ہو اور اسی نور ایزدی کے پرتو سے کروڑوں میل تک عرش کا حصار بقعہ نور بن گیا
تخت کے نیچے شاندار کرسیوں پر تین جلیل القدر سپہ سالار جلوہ افروز ہیں - میکائیل - اسرافیل - جبرائیل -
تخت کی غلام گردش میں ستر ہزار طاق ہیں - ہر طاق میں ستر ہزار فرشتے سبز سجود سبحان ربی الاعلیٰ اور سبحان ربی العظیم کا وظیفہ پڑھ رہے ہیں - اس کے علاوہ کروڑوں ہمدون فرشتے قیام میں دست بستہ کھڑے ہیں اور انوار الہی کی کرنوں سے اپنی آنکھوں کو منور کرتے ہوئے :-
حسبنا الله ونعم الوکیل - نعم المولیٰ ونعم النصیر کا ورد کرتے ہیں -
جب شرابا ظہور کے جام سب چھوٹے بڑے سب ملا خٹھ فرا چکا تو رقص و سرود بند ہوا اور جبرائیل کے توسط سے خداوند عالم نے ملائکہ
کو خطاب کر کے فرمایا :-

”میرے فرماں بردار ہزارہ فرشتو - تم پر بار بار میری رحمت ہو - اور ابلیس پر میری لعنت ہو :-

”تم سب گواہ رہو کہ قیامت کے دن ابلیس اور اس کے ساتھیوں کا منہ کالا ہوگا اور انھیں بڑا درد دینے والا عذاب دیا جائے گا
اور تم سب نیک بندوں کا منہ روشن ہوگا اور تمھیں جنت میں مزے مزے کی نعمتیں دی جائیں گی -
میں تمھیں آگاہ کرتا ہوں کہ دور بہت دور جنت کے ایک کونے میں میری ایک مخلوق ہے جسے آدم کہتے ہیں - اس مخلوق کو میرے سیدھے
راستہ سے ہٹا کر اپنے ٹیڑھے راستہ پر لے جانے کے لئے شیطان المرجم اپنی ذریات سے مشورہ کرنے والا ہے - پس تم گواہ رہو کہ اگر ابلیس یعنی
شیطان جیم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو میں اپنے بیٹے یسوع کو اس مخلوق کے درمیان اتاروں گا تاکہ وہ آدم کو ہدایت دے اور اس کے
شرمناک گناہوں کا کفارہ ہو جائے - جو میرے بیٹے پر ایمان لائے گا اس کے سب گناہ بخش دئے جائیں گے اور اسے مرنے کے بعد فردوس
میں تمھارے ساتھ جگہ دی جائے گی اور جو یسوع پر ایمان نہیں لائے گا اور اسے میرا بیٹا نہیں جانے گا اور اس کا کلمہ نہیں پڑھے گا اور ابلیس
یعین کے راستہ پر لگ جائے گا اس کی سب نیکیاں اکارت جائیں گی اور اس کا وہی حشر ہوگا جو ابلیس یعین کا ہونے والا ہے -

پس اسے میرے فرماں بردار فرشتو ! تم سب میرے فرماں کے گواہ رہو - قسم ہے مجھے میری ہزرگی کی اور جبرائیل کے سر کی کہ میں
اپنا وعدہ پورا کر کے رہوں گا - چاہے ابلیس اور اس کی ناپاک ذریات کو یہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ معلوم ہو :-

”اے میرے نیک فرماں بردار فرشتو ! تم سب دن رات میری حمد و ثنا کرتے رہو تاکہ تم پر میری رحمتیں زیادہ ہوں اور تم کو میری پاک
ذات کا زیادہ سے زیادہ قرب حاصل ہو سکے - تم میں جو کوئی زیادہ عبادت گزار ہے میرے نزدیک وہی زیادہ بلند مرتبہ والا ہے - والسلام“

ایک زور کی دل ہلا دینے والی گرج سنائی دی۔ اور معاً تخت پاک غائب ہو گیا اور چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا۔ تمام فرشتے جو سرفرد ہاتھ باندھے کھڑے تھے یکبارگی سجدے میں گر پڑے اور خداوند عالم کی تسبیح پڑھنے لگے۔

جبریل نے انگلی کے اشارہ سے ستر ہزار سورج پیدا کئے اور نئے سرے عرشِ معلیٰ کے قلعہ کو منور کر دیا۔ تمام فرشتے چاندی کی مرصع کمرسیوں پر ڈٹ گئے اور باضابطہ ملائکہ کی مجلسِ شوریٰ گرم ہوئی۔ میکائیل صدارت کے یا قوتی تخت پر رونق افروز ہوئے۔ اُن کے داہنے ہاتھ کی جانب اسرافیل اور بائیں ہاتھ کی سمت جبریل سہرے لباس میں جلوہ فرما ہو گئے۔ میکائیل ————— حضرات — میں آپ کا بہت شکریہ گزار ہوں کہ آپ نے اس ناچیز حقیر کو اپنے گرانقدر جلسہ کا صدر منتخب کیا۔ حضرات۔ آج کا دن بڑا ہی مبارک دن ہے۔ آج کے دن خداوند عالم کی مدد سے ہماری فوجوں کو نافرمان باغیوں پر فتح حاصل ہوئی اس لئے میں صدارت کے تخت سے خداوند عالم عزائے شکر کی تجویز پیش کرتا ہوں۔ صرف اس کی پاک ذات تمام شکریوں کی مستحق ہے۔ (چاروں طرف سے آمین آمین کی صدا میں بلند ہوئیں)

”میں حکم دیتا ہوں کہ اس تجویز کے مقدس الفاظ نور کے حرفوں میں لکھ کر لوح محفوظ پر لکھا دئے جائیں۔“ (ایسا ہو گیا۔ لوح محفوظ پر یہ الفاظ جگمگانے لگے)

اب دوسری تجویز جناب اسرافیل پیش کریں گے۔ اسرافیل ————— معزز صدر و حاضرین کرام۔ خداوند عالم عزائے شکر کے فرمان سے آپ حضرات کو معلوم ہو گیا ہے کہ خداوند عالم اپنے بیٹے خداوند یسوع کو آدم کی برایت کے لئے دور دراز جنت کے کسی مقام پر بھیجنے والے ہیں۔ اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ جس روز خداوند یسوع اس مخلوق کے درمیان سبوت ہوں اس روز ہم سب بکھرا سہی عرشِ معلیٰ کے قلعہ میں جمع ہوں اور خوشیاں منائیں۔ (چاروں طرف سے آمین آمین کی پر زور صدا میں بلند ہوئیں)

میکائیل ————— میں حکم دیتا ہوں کہ اس تجویز کے مقدس الفاظ بھی نور کے حرفوں میں لکھ کر لوح محفوظ پر نصب کر دئے جائیں (اور ایسا ہو گیا۔ لوح محفوظ پر یہ الفاظ جگمگانے لگے)

اب تیسری تجویز عالی جناب جبریل پیش فرمائیں گے۔ جبریل ————— معزز صدر و حاضرین کرام۔ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ ابلیس کے لشکر کو زک دینے کے لئے ہم سب کو کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ اور کروڑوں برس تک اس کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اب خداوند عالم عزائے شکر کی مدد سے ہمیں اس پر پوری کامیابی ہو گئی اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ آسمانوں سے نکال دیا گیا۔ اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ ہم لوگ تہلیل سے پہلے ایک دفعہ ابلیس پر ضرور لعنت کر لیا کریں اور اس کے شر سے پناہ مانگا کریں۔

(چاروں طرف آمین آمین کا شور بلند ہوا)

میکائیل ————— میں حکم دیتا ہوں کہ اس تجویز کے مقدس الفاظ بھی نور کے حرفوں میں لکھ کر لوح محفوظ پر لگا دئے جائیں۔ (اور ایسا ہو گیا۔ لوح محفوظ پر یہ الفاظ جگمگانے لگے)

اب جلسہ پر خاست کیا جاتا ہے۔ عزرائیل ————— حضور میں بھی ایک ضروری تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میکائیل ————— اب کوئی تجویز پیش نہیں ہو سکتی۔ خداوند عالم عزائے شکر کی طرف سے صرف تین تجویزوں کی اجازت ملی ہے۔ (منا تمام فرشتے غائب ہو گئے اور قلعہ عرش خالی ہو گیا)

آسمانوں کے پردے گر گئے۔ جہنم کے دروازے بند ہو گئے۔ سونے کے محل کی چھت جگر گئی۔ ابلیس اور اس کے ساتھیوں کی آنکھیں مہر اور پر کی طرف جھی ہوئی ہیں۔ سکتہ کا عالم ہے۔

ابلیس ہوشیار ہو جاؤ۔ اے محترم شہزادو ہوشیار ہو جاؤ۔ تم نے یہ آسمانی کھیل دیکھا! یہ دلفریب تماشا دیکھا، یہ تماشا صرف اس کے دکھایا گیا ہے کہ تم جنت کے عیش و عشرت کی لالچ میں آکر بہک جاؤ اور غلامی کے سنہرے طوق گئے میں ڈال لو۔ مگر نہیں ہمارے مقلد رجاعت کا ایک فرد بھی بھٹک نہیں سکتا۔ بہک نہیں سکتا۔ ہمیں آگ کی زنجیریں پہننا قبول ہیں مگر غلامی کا تاج منظور نہیں۔

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں

ہیں گرفتار بلا زنداں سے گھبراہٹیں گے کیا

محترم شہزادو۔ اب مزید غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ خود آسمانی روشنی کے پردے ہم پر کھل چکے ہیں اور آدم کا راز فاش ہو گیا ہے۔

خدا شرے بر انگیزد کہ خیر ماوراں باشد

میں خوب جانتا ہوں کہ آدم عرش والے دیوتا کی عزیز ترین مخلوق ہے اور اسی مخلوق میں وہ اپنا بیٹا مبعوث کرنے والا ہے۔ مگر قسم ہے تمہارے سر بلند سروں کی کہ میں اس مخلوق کو چٹکیوں میں باغی کر دوں گا اور اس کے ایک فرد کو سرکشی اور نخوت کا داعی بنا دوں گا بلکہ خود یسوع کو بھی اس کے باپ کے خلاف کھڑا کر دوں گا اور کل ہی تم دیکھو گے کہ یسوع کے ہاتھ میں بغاوت کا جھنڈا اور آزادی کی تلوار ہے۔

(زور کی تالیاں بچیں)

آدم، محض ایک مجبور العقل ہستی ہے۔ مجلس مٹی کی بنی ہوئی۔ پانی کی افتاد۔ خود ستا و خود پرست۔ طامع و حرصی۔ مغرور و متکبر ذلیل و لپست۔

عالم کیف ہے داتاے رموز کم ہے

خیر اب بتاؤ۔ کون ہے جو جنت میں آدم سے ملنے جائے گا۔ اور اسے خدا کے خلاف باغی کر دے گا۔

چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ جہنم کے بند دروازے کیونکر کھل سکتے تھے۔ جہنم سے باہر نکلنا محال تھا۔ شیاطین ایک دوسرے کا منہ تھپتھپانے لگے کسی کو منہ کھولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ابلیس نے کہا۔

”میں خود جاؤں گا۔ یہ میرا کام ہے۔ تکلیفوں اور مصیبتوں کے سمندر کی غواصی میرا کام ہے۔ میں اکیلا جاؤں گا تنہا۔ اور بہت جلد تمہارے پاس واپس آ جاؤں گا اور تمہیں اپنی معلومات سے بہرہ اندوز اور اپنی کارروائیوں سے آگاہ کروں گا۔“ جلسہ برداشت ہوا۔

(پردہ گر جاتا ہے)

چوتھا سین۔ جہنم کا دروازہ

ابلیس جہنم کی ناری فضا میں اڑتا ہوا اُس مقام پر پہنچا جو جہنم اور آسمان کے مابین واقع ہے۔ وہاں دروازہ پر اُس نے ایک عجیب حیوان دیکھا جس کے دس سینگ اور سات سر تھے۔ اُس کے سینگوں پر دس تاج اور سروں پر سات کفر کے نام لکھے ہوئے تھے اس کا منہ بہر کا سا تھا اور پاؤں ریچھ کے سے اور سینہ قیندوس کا سا اور دھڑاڑ دہے کا سا۔ اس کی بچھوؤں کی سی ایک سو دس تھیں اور ان میں ڈنک بھی تھے۔ وہ حیوان ابلیس کو دیکھ کر کڑک کر بولا :-

”خبردار۔ نابکار۔ ذرا آگے بڑھا اور میں تجھے سمو چاٹگل گیا۔ خبردار۔“

اُس حیوان کے پیچھے ایک عورت نظر آئی جو آفتاب کو اوڑھے ہوئے تھی اور چاند اُس کے پاؤں کے نیچے تھا۔ اور بارہ ستاروں کا تاج اُس کے

سر پہ تھا۔ وہ ہمہ وقت حاملہ اور بچہ جنمنے کی تکلیف میں رہتی تھی۔ یہ عورت اُس حیوان کی بیوی تھی۔ ہر روز اس کے پیٹ سے دو بڑے بڑے کتے کے پٹے پیدا ہوتے۔ جنہیں وہ حیوان فوراً کھا جاتا تھا۔ کسی دن اگر اُس عورت کے بچے پیدا نہ ہوتے تو حیوان اُسے بہت تکلیف دیتا اور کہتا۔ ”جلدی بچے جن۔ نہیں تو میں تجھی کو سمو چا کھا جاؤں گا“

وہ عورت دراصل حیوان کی ماں تھی مگر اُس نے اُسے زبردستی بیوی بنا رکھا تھا۔ دونوں میں خوب ان بن رہتی اور اسی ان بن میں دونوں خوش تھے۔

حیوان کی کڑک سنتے ہی عورت اپنے غار سے باہر نکل آئی اور ابلیس کو سچاں کر اپنے خاوند پر پکی :-

”سجدہ کر۔ فردار۔ سجدہ کر۔ یہ ہمارے آقا خداوند ابلیس خداوند جہنم ہیں“

حیوان ڈرا اور جھٹ سجدہ میں گر پڑا۔ عورت بھی سجدہ میں جھک گئی۔ دونوں ابلیس کی تسبیح و تمجید کرنے لگے۔ ابلیس نے بلند آواز سے کہا :- ”اے بد نصیب دربانو! تمہیں آسمانی دیوتاؤں نے بدترین عذاب میں پھنسا رکھا ہے۔ تمہاری لعنت بدترین لعنت ہے۔ افسوس تم اپنی غلامی میں خوش ہو اور اپنی بدکاری کو عیش و عشرت سمجھے ہوئے ہو اور جہنم کی ذلیل دربان پر فخر کرتے ہو۔“

اُسے بد نصیب حیوانو! جاگو! ہوش میں آؤ، اور طیار رہو، عنقریب میں اُس عرش والے دیوتا سے جنگ کرنے والا ہوں جس نے تمہیں نجس اور ناپاک ٹھہرا کر جہنم کی نگرانی کا ذمہ دار بنایا ہے

اُسے بد نصیب حیوانو! میں بہت جلد تمہیں اس مکروہ غلامی سے نجات دلاؤں گا۔ مگر تم بھی اپنے فراہش میں غفلت نہ کرنا۔ جب ہمارے لشکر جنگ کا بگل بجائیں۔ تم بھی کھڑے ہو جانا اور ہمارا ساتھ دینا۔ غنیم کی فوجوں کی کثرت سے نہ ڈرنا، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اور تمہاری کامیابی یقینی ہے۔

عورت — ”خداوند تم سچ کہتے ہو۔ ہم تمہارے حکم کے بندے ہیں اور تمہارے حکم کو خدا کا فرمان جانتے ہیں۔“

ابلیس — ”میں باہر جاتا ہوں دروازہ کھول دو“

عورت نے اپنے سر کے سوچ میں سے ایک آتشیں نیزہ لیا اور اپنے خاوند کا پیٹ پھاڑ کر اُس کی آنتوں میں سے جہنمی کنجی نکالی اور ابلیس کو دیدی۔ ابلیس نے اُسی خون آلود کنجی سے باب لعنت کا پھاٹک کھولا اور جہنم سے باہر نکل آیا اور یہ جاوہ جا غائب ہو گیا۔ ابلیس آسمانوں سے گزرتا ہوا کمرہ آفتاب پر پہنچا۔ وہاں سے اس نے باغ عدن کا پتہ لگایا جہاں آدم اور اس کی بیوی حوا رہتی تھی۔ وہ ہر مقام پر خداوند عالم کے خلاف زہر اگتا گیا اور بہت سی ہستیوں کو اپنے پیدا کرنے والے کے خلاف بہکانے میں کامیاب ہو گیا اور آخر کار باغ عدن میں پہنچ گیا۔

پانچواں سین — باغ عدن

عدن ہو، بہو، ابلیس کے پرانے مسکن باغ فردوس کا نمونہ تھا۔ وہاں کے دلفریب مناظر، پھولوں کی روشیں مرمے کے فوارے، درجہ کے محل، دودھ کی نہریں، شہد کے حوض، شراب طہور کی تہلیں، رنگ رنگ کے پردے، طرح طرح کے جانور اور صبح و شام کی رنگینیاں دیکھ کر ابلیس کا دل بھر آیا۔

اس نے چاہا کہ تو یہ کراں اور پھر فردوس میں جا کر آرام و راحت کی زندگی بسر کروں۔ مگر پھر اُسے اپنی فوجوں کا خیال آیا جو جہنم میں سر رہی تھیں۔ اور اس کا ارادہ پٹا۔ اس نے کہا۔

نہیں، نہیں۔ میں اپنی عالی حوصلہ ذریات سے غداری نہیں کروں گا۔ یہ جنت کا عیش و عشرت کمزوروں اور بد بختوں کے لئے ہے۔ میں کسی بزرگ تر ہستی کا دامن پکڑ کر جنت میں داخل نہیں ہوں گا۔ یہ میرے لئے ننگ و عار ہے۔

حقاکہ با عقوبت دوزخ برابر است

رفتن پیائے مردی ہمسایہ در بہشت

میرے لئے تلوار کی چھاؤں اور بجلیوں کی بوچھاڑ میں جنتوں کی راحتیں ہیں۔

دلکھا دمل کا تاشا دی اگر فرصت زمانہ نے

مرا ہر داغ دل اک سر دے ہے نجم و چراغ کا

وہ مسلسل اپنے تیز چاندی کے پروں سے اڑتا رہا یہاں تک کہ آدم کے محل میں جا پہنچا۔ آدم اور حوا آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ خاموش سنتا رہا۔

آدم ————— سب تعریف اللہ عز اسمہ کے لئے ہے۔ آج تم اداس کیوں ہو؟

حوا ————— میری! میں آنکھ پھڑکتی ہے۔ اللہ عز اسمہ اپنا فضل کرے۔ آج باغ کی ہوا کچھ بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔

آدم ————— خوب یاد آیا، ابھی وادی ایمن میں جبریل علیہ السلام تشریف لائے تھے اور انھوں نے اللہ عز اسمہ کی طرف سے خبر دی ہے کہ ابلیس لعین یعنی ایک راندہ ہوا فرشتہ بغیر اجازت کے باغ عدن میں داخل ہو گیا ہے اور عنقریب ہم دونوں کو بہکانے والا ہے۔ لہذا اللہ عز اسمہ نے ہدایت کی ہے کہ ابلیس لعین کے دھوکے میں نہ آئیں اور شجر ممنوع جو علم و روشنی کا درخت ہے اس سے ہمیشہ دور رہیں۔ کیونکہ اس درخت کا پھل کھانے سے ہم پر اللہ عز اسمہ کا غضب نازل ہوگا۔

حوا ————— سب تعریف اللہ عز اسمہ کے لئے ہے۔ ہم لوگ ہرگز خداوند عالم کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گے اور ابلیس کے بہکانے میں نہیں آئیں گے۔

حوا ابھرے سوچ میں پڑ گئی اور بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ آدم ہاسر چلا گیا۔ ابلیس موقع پا کر اندر داخل ہوا۔ اور خواب میں حوا پر ظاہر ہوا۔ ابلیس ————— اے جنت کی رہنے والی۔ تو کیوں غفلت کی نیند میں پڑی ہے۔ کیا تو نے شجر علم کا پھل نہیں کھایا جو تیری غفلت کو دور کر دے گا اور تیری آنکھوں سے یک قلم جہل و نادانی کے پردے اٹھا دے گا۔

حوا ————— سب تعریف اللہ عز اسمہ کے لئے ہے۔ میں شجر علم کا پھل ہرگز نہیں کھاؤں گی۔ کیونکہ اللہ عز اسمہ نے وہ پھل چکھنے کی ممانعت کی ہے اور میں اللہ عز اسمہ کی نافرمان نہیں ہوں۔ آج ہی جبریل علیہ السلام نے خداوند عالم کے حکم کی تجدید کی ہے۔ میں اس پھل کے قریب نہیں جاؤں گی۔

ابلیس ————— اے نادان عورت۔ اے علم و دانش کے نور سے بے بہرہ نازنین! میں تجھے اور تیرے خاوند کو آگاہ کئے دیتا ہوں کہ تم دونوں سخت دھوکے میں ہو۔ تو جب تک علم کے درخت کا پھل نہیں کھائے گی۔ تجھے کیونکر معام ہوگا کہ تیرا دوست کون ہے اور دشمن کون سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔ نادان عورت۔ علم ہی وہ نعمت ہے۔ جو کورۂ عالم کی تمام رحمتوں کا سرچشمہ ہے۔ خود جبریل بھی اس جنتی پھل کی لذت سے محروم ہے۔ وہ بھلا تجھے اور تیرے خاوند کو کیا نیک مشورہ دے سکتا ہے۔ میں البتہ علم کے درخت کا پھل کھاتا ہوں اور تمام فرشتوں کا استاد ہوں۔ میرا لقب معلم الملکوت ہے، میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ ضرور علم درخت کا میوہ کھایا کر اور اپنے خاوند کو کھلایا کر۔

حوا ————— تیرا کیا نام ہے؟

ابلیس ————— ابلیس

حوا ————— لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ مٹا حوا کی آنکھ کھل گئی اور ابلیس اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

عدن کا ایک اور منظر

ابلیس، حق کے محل سے کوئی سو قدم پر گیا ہوگا کہ سامنے سے جبرئیل علیہ السلام نمودار ہوئے

جبرئیل — تو یہاں کیوں آیا ؟

ابلیس — تاکہ تیری کوتاہ فہمیوں کا پردہ فاش کروں

جبرئیل — تو یہاں کس کی اجازت سے آیا ؟

ابلیس — اجازت - میرے لئے کسی کی اجازت ضروری نہیں - اجازت تو صرف تیرے جیسی غلامِ روحوں کے لئے ہے - میں خود اپنی

اجازت سے آیا ہوں -

جبرئیل — اچھا، تو اب فوراً چلا جا - ورنہ تجھے دردناک سزا دیں گا -

ابلیس نے اپنا بے پناہ نیزہ اٹھایا اور قریب تھا کہ جبرئیل کے سینے میں اتار دے کہ اُس کا ہاتھ خود بخود شل ہو گیا - دوسرے ہاتھ سے

اُس نے تلوار اٹھانا چاہی - مگر وہ ہاتھ بھی معطل ہو چکا تھا اور اُس کے سارے بدن پر فالج گر گیا -

جبرئیل نے اپنا عصا زور سے ابلیس کے سر پر مارا - اور وہ شہابِ ثاقب کی طرح لڑھکتا اور پٹھنیاں کھاتا ہوا باغِ عدن سے نیچے گرا -

اور ساتوں آسمانوں سے ہوتا ہوا - ایک حق و دق مقام پر پہنچا جسے زمین کہتے ہیں -

اس مقام پر آدم و حوا بھی موجود تھے اور ان کے ہاتھوں میں علم و دانش کے دو روشن پھل تھے - دونوں شرانے لگے کیونکہ بالکل

ننگے تھے اور رونے لگے کہ اپنی خطا پر نادم تھے اور ڈرنے لگے کہ خدا کا غضب قریب تھا -

ابلیس — اے نادان انسانو! - نہ ڈرو - نہ روؤ اور نہ شراؤ - میں تمہارے ساتھ ہوں اور تمہارے ساتھ رہوں گا - کیا ہی مبارک

ہیں وہ ہستیاں جو علم و دانش کا پھل ہاتھوں میں لئے ہیں -

دفعۃً آسمان پھٹ گیا - بجلیاں چکیں - ابلیس کی گردن میں لعنت کا طوق پڑ گیا اور وہ ایک ریگتا ہوا سانپ بن گیا اُس کی ذریات

بھی اسی زمین پر آگئی اور ساری زمین پر تاریکی چھا گئی -

محمد اسحاق (امری))

عورت اور تعلیماتِ اسلام

از

مالک رام ایم - اے

ماواقف لوگوں کی طرف سے اسلام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس نے عورت کی اصلاح اور اُس کے حقوق کی حفاظت کا خیال نہیں

کیا اور اس کو لونڈی کی حیثیت سے آگے بڑھنے نہیں دیا - مالک رام صاحب نے اس تصنیف میں بتایا ہے کہ گہوارہ سے لیکر لحد تک عورت

اور اس کی زندگی کی اصلاح کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو اسلام نے ترک کر دیا ہو اور اس کا اقتدار قائم کرنے کی انتہائی تاکید نہ کی

ہو - اس کتاب میں عورت سے متعلق کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جس سے بحث نہ کی گئی ہو -

نہایت نفیس کاغذ پر پاکیزہ کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کی گئی ہے

نیچرنگار لکھنؤ

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

فن تحریر کی تاریخ

(سلسل)

آرمینی رسم خط (Armenian) آرمینی، ہند یورپی زبان کی ایک شاخ ہے۔ اس کا رسم خط عیسائی مذہب کے آرمینیا میں پھیلے اور آرمینی کلیسا کے آزاد ہونے پر ظاہر ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خط سینٹ میسروب نے ایجاد کیا تھا۔ تحقیقات جدید کے مطابق آرمینی خط اشکانی پہلوی پر مبنی ہے (دیکھئے نقشہ نمبر ۱۱) گرجی کے برخلاف اس نے سامی حروف کے ناموں کو کسی حد تک محفوظ رکھا ہے جو اس کے آرامی الاصل ہونے کا ثبوت ہے۔ نئے حروف قدیم حروف میں خفیف سے تغیرات کے بعد بنائے گئے تھے۔ پہلے اس خط میں ۳۶ حروف کام آتے تھے۔ بارہویں صدی میں دو یونانی حروف کا اضافہ کیا گیا، ان ۳۸ حروف سے ۲۰,۰۰۰ تک اعداد ظاہر کئے جاتے ہیں (دیکھئے نقشہ نمبر ۱۳)

پانچویں صدی عیسوی آرمینی ادب کا "عہد زریں" تھا اور اس کے قدیم ترین مخطوطات کا زمانہ ۸۸۰ء اور ۹۸۹ء ہے۔ گرجی رسم خط (Georgian) گرجستان یا جارجیا، کوہ قاف کے جنوب میں واقع ہے۔ یہاں کے لوگ جو گرجی کہلاتے ہیں ساتویں صدی ق۔ م سے آباد ہیں۔ ان کی موجودہ آبادی تخمیناً ۲۰ لاکھ ہے۔ ان کی زبان کاکیشی زبان کی جنوبی مغربی شاخ ہے۔ جارجیا کا "عہد زریں" بادشاہ داؤد دوم، جارج سوم اور ملکہ تیمارا کا عہد حکومت یعنی بارہویں صدی اور تیرہویں صدی کا آغاز تھا۔ اس کا خاتمہ جارج چہارم کی منگولوں کے ہاتھوں شکست سے ۱۲۲۳ء میں ہوا۔

اقسام — گرجی خط کو پہلے دو حروف کے نام پر "ان بن" کہتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں:-

- (۱) کھت سری — "پادریوں کا رسم خط" جو کلیسا تک محدود ہے۔ اس میں ۳۹ حروف کام آتے ہیں جن کی شکلیں تہ تکلف اور زاویہ دار ہیں۔
- (۲) میکھدرلی — "سپاہیوں کا رسم خط" جسے عوام بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس میں ۴۰ حروف کام آتے ہیں جن کی شکلیں گھسیٹ اور گولائیاں لئے ہوئے ہیں۔

ایجاد — کھت سری اور میکھدرلی حروف کی شکلوں میں بہت فرق ہے۔ لیکن فی الحقیقت ان کا ماخذ وہی ساسانی پہلوی خط تھا جو آرامی سے ماخوذ تھا (دیکھئے نقشہ نمبر ۱۱)

گرجی نے آرمینی کے برخلاف حروف کی قدیم سامی ترتیب کو محفوظ رکھا ہے، جو اس خط کے آرامی الاصل ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ قدیم سامی میں حروف سے ۴۰۰ تک کے اعداد ظاہر کئے جاتے تھے، لیکن گرجی کے جدید حروف ۱۰,۰۰۰ تک اعداد ظاہر کئے جانے لگے۔ کہتے ہیں کہ یہ خط بھی سینٹ میسروب نے یونانی خط کو پیش نظر رکھ کر ایجاد کیا تھا اور یہ واقعہ ہے کہ اس خط میں دو چار حروف یونانی سے لیکر ضرور اضافہ کئے گئے ہیں لیکن ان کی بنا پر اس خط کو یکسر یونانی الاصل نہیں کہا جاسکتا۔

نئے حروف جو قدیم حروف میں خفیف سی تبدیلیوں کے بعد بنائے گئے تھے سینٹ میسروب کی ایجاد ہو سکتے ہیں اس لئے انھیں اخیر میں رکھا ہے۔ (دیکھئے نقشہ نمبر ۱۴)

وسط ایشیا کے رسوم خط — سن کیاٹنگ کا چینی صوبہ یا مشرقی ترکستان جو اب ریگستان ہے ساتویں یا آٹھویں صدی عیسوی میں خوبصورت

شہروں کا ایک ملک تھا۔ یہاں پہلے مختلف زبانیں (ایرانی، ہندوستانی، چینی، ترکی وغیرہ) بولنے والے اور مختلف مذاہب (مانوی، نسطوری اور بدھی) کے ماننے والے لوگ آباد تھے لیکن اب ایک مختصر سی آبادی ہے جس کا مذہب اسلام اور زبان ترکی ہے۔

برطانوی، جرمن، روسی، فرانسیسی، جاپانی اور دو سسری تحقیقاتی مہموں نے یہاں حیرت انگیز اکتشافات کئے ہیں۔ ماہرین آثار قدیمہ نے چینی ترکستان سے ایسے مسودے برآمد کئے ہیں جن سے قرون وسطیٰ میں فارس اور مشرق بعید کے سیاسی اور معاشی تعلقات پر بڑی روشنی پڑتی ہے۔ بعض مغربی مستشرقین نے تحقیق سے دونی زبانوں کا حال معلوم کیا ہے ایک سوغدی اور دوسری توخاری جن کا تعلق ہند یورپی زبانوں سے ہے۔

سوغدی رسم خط (Sogdian) - سوغدی یا سغدی زبان قرون وسطیٰ میں پورے وسط ایشیا کی بین الاقوامی زبان تھی منگولی اور عربی فتوحات کے بعد اس کا خاتمہ ہو گیا اور اب مہملی یاد دلانے کے لئے زرافشان کی بالائی وادی میں یغیونی نام کی ایک بولی باقی رہ گئی ہے۔ سوغدی رسم خط، آرامی خط کی ایک مقامی شاخ سے ماخوذ تھا۔ بعد میں نسطوری سے بھی متاثر ہوا۔ اس کی زیادہ قسمیں نہ تھیں۔ ابتدائی دور کی سوغدی میں حروف کو ایک دوسرے سے باقاعدہ نہیں ملایا گیا ہے لیکن دوسرے دور میں انھیں باقاعدہ ملایا گیا ہے۔ دیگر سامی رسوم خط کی طرح یہ بھی حروف صحیح کی لکھائی تھی، حروف علت آ، و، اور سی کو لکھنے میں اکثر چھوڑ دیا جاتا تھا۔

مشہور کتبے اور مسودے نویں صدی کا ایک کتبہ جو تین زبانوں (ترکی، سوغدی اور چینی) میں ہے، قارا بلگاسوں کے علاقہ میں ملا ہوا۔ یہ اہم کتبہ قدیم سوغدی کے استعمال کی شمالی حد مقرر کرتا ہے۔ اس کی جنوبی حد مقرر کرنے کے لئے ایک چھ سطروں والا سنگی کتبہ ہے جو دماغ میں تبت کی سرحد پر ملا تھا۔

مشرقی ترکستان میں طوفان کے مقام پر (سین فو تنگ یا "سہتر بدھ" ایک ہزار بدھ) کی خانقاہ سے سوغدی مسودے ملے اور کچھ شمالی مشرقی چین سے برآمد ہوئے۔ یہ مسودے نندن، پیرس، لینن گراڈ اور برلن میں محفوظ ہیں۔

قدیم ترین مسودے (جو سین فو تنگ میں ملے تھے) دوسری صدی عیسوی کے اور بقیہ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی کے ہیں۔ عیسائی، مانوی اور بدھ مذاہب سے متعلق ہیں۔ انھیں پڑھنے کا شرف جرمن علماء، ایف، سی، اینڈ بیس ایف ڈبلیو مولر اور فرانسیسی عالم آرگوتھیت کو حاصل ہے۔

یوئنگر یا یوگوری رسم خط (Uighur)۔ اس خط کا نام آن مہذب "تاتاری قبیلوں کے نام پر ہے جو خیوآ اور بخارا میں حکمران تھے پہلے اسے نسطوری (سریانی) سے ماخوذ سمجھا جاتا تھا لیکن اب اس کا ماخذ سوغدی رسم خط کو مانا جاتا ہے۔ کیونکہ دونوں میں بعض خصوصیات مشترک ہیں۔

بارھویں اور تیرھویں صدی میں چنگیز خاں اور اس کے جانشینوں نے یوئنگر لوگوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ اس طرح یوئنگر رسم خط پوری منگول سلطنت میں عام مراسلت کا خطاب بن گیا اور اس سے موجودہ منگول، قلماتی اور مانچو رسوم خط نکلے۔

تیرھویں صدی میں مارکو پولو کو ترکی اور منگولی قبیلوں حتیٰ کہ چین میں بہت سے عیسائی ملے لیکن اسلام کی ترقی کے ساتھ ساتھ وہاں سے عیسائی مذہب غائب اور بدھ مذہب پسپا ہو گیا۔ خود یوئنگر رسم خط کی جگہ عربی خط نے لے لی جو اب خان کی قلمرو کا واحد رسم خط ہے۔

قدیم یوئنگر ادب کی ایک اہم یادگار ایک "تاتاری نظم کا مسودہ ہے جس کا نام ہے "علم جو شاد کام بناتا ہے" (گردنگو بلک) یہ ایک طویل نظم ہے جس میں ہر طرح کے لوگوں کے حقوق و فرائض، خوبوں اور خرابیوں اور کردار کا ذکر ہے۔ نظم ۴۰-۱۰۶۹ میں تصنیف کی گئی تھی ۱۱۱۷ء میں مقام ہرات لکھا گیا اور اب وہ ویانا کی امپیریل لائبریری میں محفوظ ہے۔

یہ نظم صرف اس لئے اہم ہے کہ وہ کسی بھی ترکی قبیلے کی سب سے پہلی ادبی کاوش ہے بلکہ تاتاری زبان کا قدیم ترین نمونہ ہے۔ فن تحریر کی تاریخ میں بھی اس کا ایک خاص مقام ہے۔ اس کا رسم خط سوغدی اور مختلف منگولی خطوں کی درمیانی کڑی ہے۔ (ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۱۵)

منگولی رسم خط (Mongolian) تیرہویں صدی کے ابتدائی زمانہ تک منگولوں کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی لیکن چنگیز خاں نے منگولوں کو متحد کر لیا اور چند سالوں میں اس کی سلطنت کو ریا سے جنوبی روس تک پھیل گئی۔

چنگیز خاں کے مرنے کے بعد (متوفی ۱۲۲۷ء) یہ سلطنت پارہ پارہ ہو گئی اور جب قبلائی خاں (۱۲۵۹ - ۱۲۶۴ عیسوی) نے دار الحکومت کو پکنگ منتقل کیا تو مغرب میں عیسائی اور اسلامی ممالک کو آزادی ملی گئی اور مشرق میں بدھ مذہب کا اثر و نفوذ بڑھ گیا۔ اہل مشرق کو منگولی تمدن سے آشنا کرنے کے لئے قبلائی خاں نے تبت کے ایک لاما کو حکم دیا کہ وہ بدھ مذہب کے صحیفوں کا سنسکرت اور تبتی زبانوں سے منگولی زبان میں ترجمہ کرے اس نے یوگری رسم خط میں منگولی زبان کے لکھنے کی امکانی کوشش کی لیکن وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہوا۔

چودھویں صدی کے آغاز میں (Tsordji Osir) نے پھر اس کام کو شروع کیا اس نے یوگری نشانات میں ضروری ترمیمیں کیں اور تبتی رسم خط سے پانچ نئے حروف کا اضافہ کیا۔ اس لکھائی کو 'منگول کالک' کہتے ہیں (یہ لفظ غالباً سنسکرت لفظ کا لیکھ سے بنا ہے۔ سنسکرت ابجد کا پہلا حرف ہے اور لیکھ کے معنی لکھنے کے ہیں) غیر مذہبی استعمال کے لئے یہ رسم خط بھی سچیدہ ثابت ہوا۔ لہذا اسے مختصر کیا گیا۔ اس سے تمام غیر مغربی آوازوں کے نشانات حذف کر دیئے گئے اور مشابہ آوازیں جسے ب - پ وغیرہ ایک ہی نشان سے ظاہر کی جانے لگیں۔ یہی موجودہ منگولی رسم خط ہے جو چینی کی طرح اوپر سے نیچے کو لکھا جاتا ہے لیکن چینی کے برخلاف لکھنا بائیں طرف سے شروع کرتے ہیں۔ مانچو (Manchu) — یہ مانچو ریا میں رائج ہے۔ مانچو سلطنت کی بنیاد تیرہویں صدی عیسوی میں پڑی۔ اس وقت تک یہ لوگ منگولی زبان اور رسم خط استعمال کرتے تھے۔ ۱۵۹۹ء میں مانچو شہنشاہ تائی سو (Tai Tsu) نے دو عالموں کو ایک قومی رسم خط بنانے کا حکم دیا۔ انھوں نے منگولی خط کو اپنی زبان کے موافق بنانے کے لئے اس میں کافی ترمیم و ترمیم کی۔ شہنشاہ نر یا چو (۱۶۱۶ء) نے مانچو رسم خط کی طرف خاص توجہ کی۔ اس کے زمانہ میں چینی کتابوں کی نقلیں اور ترجمے اس خط میں کئے گئے۔ ۱۶۳۲ء میں اس خط میں چند امتیازی علامات (اعراب وغیرہ) کا اضافہ کیا گیا۔ ۱۶۴۸ء میں شہنشاہ چین (یا کین) لنگ (Kien lung) نے مانچو خط پر نظر ثانی کی اور ایک روایت کے مطابق اس خط کی ۳۲ حروف صورتوں میں سے ایک کو منتخب کر کے سرکاری رسم خط بنا دیا (بقیہ مسترد ہو گئے) یہی موجودہ رسم خط ہے۔ (ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۱۵)

قلماتی خط (Kalmuck) — قلماق منگولوں کی ایک شاخ ہے جو صحرائے گوبی کی مغربی سرحد سے لیکر قلماتی اسٹیپ تک آباد ہے دریائے وولگا کے کنارے بھی ان کا قیام ہے۔ یہ لوگ خانہ بدوش ہیں۔

قلماتی خط منگولی سے بہتر ہے۔ اصل میں یہ "کالک منگول" خط ہے جسے قلماتی زبان کے لئے ۱۶۴۱ء میں لاما زایہ پنڈتا کے زمانہ میں اختیار کیا گیا۔ اس میں بدھ مذہب کا بچا کھپا ادب لکھا جاتا ہے۔

منگول — مانچو اور قلماتی رسوم خط میں یہ صفت مشترک ہے کہ وہ اوپر سے نیچے کو لکھے جاتے ہیں۔ چینی کے برخلاف کالم بائیں طرف سے شروع ہوتے ہیں۔

بوریٹ (Buriat) — بیکال جھیل کے شمال میں تقریباً تین لاکھ بوریٹ منگول آباد ہیں ان کی زبان اور ان کا رسم خط منگولی رسم خط کی شاخیں ہیں۔ (باقی)

نوٹ :- اس مضمون کے ساتھ سامی رسوم خط کی شمالی شاخ کا بیان ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے آگے جنوبی سامی (یا جنوبی عربی) یونانی و لاطینی ہندوستانی رسوم خط کا ذکر کرنا ہے اور اسی کے ساتھ فنی تحریر کے مستقبل اور سامان کتابت و طباعت وغیرہ کی ایجاد کا حال بھی بیان کرنا ہے۔ سالانہ نگار ۱۹۵۵ء کے بعد مارچ ۱۹۵۶ء سے اس سلسلے کی دوسری کڑی شروع کی جائے گی۔

محمد اسحاق صدیقی

ارمنی حروف تہجی

نقشہ نمبر ۱۱

نام	بڑے حروف	چھوٹے حروف	گھسیٹ	آواز	عددی قیمت	نام	بڑے حروف	چھوٹے حروف	گھسیٹ	آواز	عددی قیمت
ایپ	Ա	ա	...	آ	۱	مین	Մ	մ	...	م	۲۰۰
بین	Բ	բ	Բ	ب پ	۲	یے	Ե	ե	...	ہے	۳۰۰
جیم	Դ	դ	Դ	گ ک	۳	نو	Ն	ն	...	ن	۴۰۰
دا	Զ	զ	Զ	د ت	۴	شا	Շ	շ	...	ش	۵۰۰
پیچ	Ծ	ծ	Ծ	ی-ئی	۵	وو	Վ	վ	...	او-وو	۶۰۰
زا	Թ	թ	Թ	ژ	۶	جھ	Ջ	ճ	...	جھ-ج	۷۰۰
ای	Ժ	յ	Ժ	ے	۷	پے	Պ	փ	...	پ-پ	۸۰۰
ایت	Ի	ի	Ի	ے	۸	چے	Ջ	ճ	...	ج	۹۰۰
تو	Լ	լ	Լ	ت-تھ	۹	را	Ր	ր	...	رز	۱۰۰۰
زہ	Ս	ս	Ս	زہ	۱۰	سے	Տ	տ	...	س	۲۰۰۰
انی	Ծ	ծ	Ծ	ا	۲۰	ویو	Վ	վ	...	و	۳۰۰۰
لیون	Լ	լ	Լ	ل	۳۰	ٹیون	Տ	տ	...	ت د	۴۰۰۰
کے	Կ	կ	Կ	کھ	۴۰	رے	Ր	ր	...	ر	۵۰۰۰
تس	Ը	ը	Ը	تس-دز	۵۰	تسو	Ր	ր	...	تس-دز	۶۰۰۰
کین	Կ	կ	Կ	گ ک	۶۰	ہیون	Ի	ի	...	اؤ	۷۰۰۰
کو	Ն	ն	Ն	ہ	۷۰	پیور	Վ	վ	...	پ پ پھ	۸۰۰۰
دز	Զ	զ	Զ	دز-تش	۸۰	کھ	Ջ	ճ	...	لک کھ	۹۰۰۰
گھت	Զ	զ	Զ	گھ	۹۰	اد	Ը	ը	...	او	۱۰,۰۰۰
ج	Ջ	ճ	Ջ	ج-جھ	۱۰۰	نہ	Ջ	ճ	...	ن	۲۰,۰۰۰

گرجی حروف تہجی

نام	چھوٹے حروف	کھتسری	آواز	عدد	نام	چھوٹے حروف	کھتسری	آواز	عدد
آ	Ⲁ	Ⲑ	آ	۱	ت	Ⲑ	Ⲑ	ت	۳۰۰
ب	Ⲃ	ⲑ	ب	۲	ا	ⲑ	ⲑ	ا	۴۰۰
گ	Ⲅ	ⲓ	گ	۳	و	ⲓ	ⲓ	و	۵۰۰
د	Ⲇ	ⲕ	د	۴	پ	ⲕ	ⲕ	پ	۶۰۰
پ	Ⲉ	ⲛ	پ	۵	ک	ⲛ	ⲛ	ک	۷۰۰
ز	Ⲋ	ⲟ	ز	۶	گ	ⲟ	ⲟ	گ	۸۰۰
ح	Ⲍ	ⲡ	ح	۷	ق	ⲡ	ⲡ	ق	۹۰۰
ط	Ⲏ	ⲣ	ط	۸	ش	ⲣ	ⲣ	ش	۱۰۰۰
ظ	Ⲑ	ⲕ	ظ	۹	چ	ⲕ	ⲕ	چ	۱۰۰۰
ف	Ⲓ	ⲉ	ف	۱۰	ت	ⲉ	ⲉ	ت	۲۰۰۰
ق	Ⲕ	ⲓ	ق	۱۰	د	ⲓ	ⲓ	د	۳۰۰۰
ک	Ⲗ	ⲛ	ک	۲۰	ت	ⲛ	ⲛ	ت	۴۰۰۰
ل	Ⲙ	ⲟ	ل	۳۰	ت	ⲟ	ⲟ	ت	۵۰۰۰
م	Ⲛ	ⲡ	م	۴۰	ک	ⲡ	ⲡ	ک	۶۰۰۰
ن	Ⲝ	ⲣ	ن	۵۰	گ	ⲣ	ⲣ	گ	۷۰۰۰
ی	Ⲟ	ⲕ	ی	۶۰	خ	ⲕ	ⲕ	خ	۸۰۰۰
ر	Ⲡ	ⲛ	ر	۷۰	ح	ⲛ	ⲛ	ح	۹۰۰۰
ز	Ⲣ	ⲉ	ز	۸۰	و	ⲉ	ⲉ	و	۱۰۰۰۰
ح	Ⲥ	ⲓ	ح	۹۰	پ	ⲓ	ⲓ	پ	۱۰۰۰۰
ط	ⲧ	ⲛ	ط	۱۰۰	ک	ⲛ	ⲛ	ک	۱۰۰۰۰
ظ	ⲩ	ⲟ	ظ	۲۰۰	ق	ⲟ	ⲟ	ق	۱۰۰۰۰

فصل في معرفة

[illegible]

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے

”صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے لیکن میری عمر تمام نہیں ہوتی!“

آج تک یاد نہیں گھر بھریں کوئی مجھ سے سویرے اٹھا ہوا اور رات میں میرے بعد سو یا ہو۔ دو کوئے البتہ ایسے ہیں جو میرے صحن میں اُن دو درختوں پر الگ الگ آکر بیٹھتے ہیں جو ایک دوسرے اور میری چار پائی سے پندرہ فٹ کے فاصلہ پر واقع ہیں اور تاروں کی چھپاؤں میں مجھے باری باری لعنت بھیجنا شروع کرتے ہیں۔ خدا جانے یہ کوئے کون ہیں۔ کہاں کے ہیں اور کیوں ہیں۔

یقیناً میاں بیوی نہیں ہیں۔ میاں بیوی میں اتنا اتفاق کہاں کہ سالہا سال پا بندی سے یک زبان ہو کر صبح کے وقت آئیں اور مجھے لعنت بھیج کر جائیں۔ دونوں عورتیں نہیں اس لئے کہ دو عورتیں ایک ہی شخص پر زیادہ دن تک لعنت نہیں بھیج سکتیں۔ ایک ان میں سے اُس شخص سے شادی کر لے گی اور طلاق لعنت بن جائے گی، دونوں مرد بھی نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ مرد کو اپنی لعنتوں سے کہاں چھٹکارا کہ وہ مجھ پر لعنت بھیجنے کی تفریح میں پڑے۔

شور کر کے اُن کو اڑا نہیں سکتا۔ اس لئے کہ یہ کوئے تو میرے شور سے اڑ جائیں گے لیکن دوسرے کوئے جو ان سے بھی زیادہ کوئے ہیں وہ اٹھ بیٹھیں گے۔ صحن میں ذرا فاصلہ پر جہاں نوکروں کا خاندان سوتا ہے وہاں بھی ایک سے ایک اچھے درخت ہیں۔ اُن کے آس پاس ہر طرح کے مقویات بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ وہاں نہ جائیں گے۔

میں ان کو چھوڑ کر اپنا کمرہ کھولوں گا، دروازہ پر پانچ سات مینڈک اور ہزاروں لاکھوں مچھروں کے اور میرے ساتھ کمرے میں داخل ہو جائیں گے۔ اب میرا کام یہ ہے کہ ان مینڈکوں کو چار پائی یا تخت کے نیچے گھس کر کھالوں اور مچھروں پر دوائی چھڑک دوں۔ مینڈک تو خدا جلنے کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ مچھروں کا حال یہ ہے کہ جب سے ان پر ڈاکٹروں نے کچھ نئے اتہانات لگائے ہیں، انھوں نے ڈی ڈی ٹی سے مرنا چھوڑ دیا۔

کمرے میں روشنی کر کے پڑھنا لکھنا شروع کرتا ہوں۔ جہاں انسپیریشن مچھروں سے ملتا ہے اور اودیشی مینڈکوں سے اور یہ بکھٹ مینڈک اتنی قریب سے داد دیتے ہیں کہ چونک پڑتا ہوں کہ میں اُن پر یا وہ مجھ پر تو نہیں بیٹھے ہیں۔

میں نے اپنے مکان کا مردانہ حصہ کچھ دنوں سے مقفل کر دیا ہے۔ کھلا رہتا تھا تو چور چار پائی اٹھائے جاتے تھے۔ مویشی باغ چر جاتے تھے اور راستے سے گزرنے والے نماز پڑھنے آ جاتے تھے۔ وہ اس طرح کہ اندر سے ٹوٹا پانی تو لیا جانا ناممکن اور ان سب کے ساتھ نماز باجماعت اپنے گھر جا کر پڑھی۔

زمان خانے کا دروازہ میرے سائبان سے خاصے فاصلہ پر واقع ہے۔ صبح سے رات کے تک کھٹ کھٹ ہوتی رہے گی اور میں جا جا کر دیکھوں گا کہ کیا حادثہ ہے۔ حادثات ملاحظہ فرمائیے۔ فلاں کا انتقال ہو گیا۔ آپ کیا کر رہے ہیں۔ فلاں کا ڈنر ہے آپ مدعو ہیں۔ فلاں رسا رہ گئے والا ہے۔ ایک مضمون لکھئے۔ اور پانچ خرمیدار بنائیے۔ فلاں مسجد بن رہی ہے۔ نماز پڑھنی ہوگی۔ فلاں کی بیوی بھاگ گئی ہے۔ ذرا چوکنے رہئے گا۔ ایک بچہ کم ہو گیا ہے۔ ذرا چوکنے رہئے گا۔ ایک بچہ کم ہو گیا ہے۔ ذرا دیکھئے گا آپ کے بچوں میں تو نہیں مل گیا میں قیل ہو گیا ہوں

ممتحن نے بے ایمانی کی ہے۔ ذراوائٹس چانسلسر صاحب سے چل کر کہہ دیجئے اور فاران سکالرشپ بھی تو وائٹس چانسلسر صاحب ہی کے ہاتھ میں ہے میرا ایک سال بچ جائے گا۔ زمینداری کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ یونیورسٹی پہنچا۔ اتنے لکچر ہیں۔ اتنے ٹیوٹوریل، اتنی ٹینک، اتنے انٹر ویو، اتنی سعی سفارش۔ گھر واپس آیا۔ ڈاک دیکھی۔ فلاں صاحب سے اتنے روپے لے لئے ہیں۔ اور ہدایت کر دی گئی ہے کہ تم سے لے لیں۔ فلاں گاڑی سے میں، بیوی، بچے، ایک ملازم اور دو نوکرائیوں کے ہمراہ ایک ہفتہ کے لئے آرہے ہیں۔ بڑا ضروری کام ہے۔ میں اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنا چاہتا تھا چاہتی ہوں۔ عنوان یہ ہوگا۔ مقالہ آپ لکھ دیجئے۔ از خردان خطا و بزرگان عطا! ایک ادبی کانفرنس ہو رہی ہے۔ صدارت فرمائیے ورنہ تازہ کلام سے شرف فرمائیے۔ میرے نانا کا انتقال ہو گیا۔ ویسا ہی ایک مضمون لکھ دیجئے جیسا کہ آپ ایسے موقع پر اکثر لکھا کرتے ہیں۔ آپ کے ہاں سے اردو میں جن لوگوں نے ڈاکٹریٹ حاصل کی ہے ان کی مقالات کا خلاصہ لکھ بھیجئے۔ کھانا کھانے بیٹھا۔ نوکروں کی چوری۔ گندگی، نکمہ پن اور دوسروں کے اختلافات و عادات پر جھگڑا شروع ہو گیا۔ نوکروں سمیت سب نے اپنے اپنے زور اور ظروف کے بقدر حصہ لیا۔ کھانا ختم ہوا۔ بات بڑھ گئی۔ کمرے میں آکر لیٹا۔ برآمدے میں بچوں نے فٹ بال شروع کر دیا۔ سینے کی مشین چلنے لگی اور نلی پر جو میرے کمرہ کی دیوار سے لگا ہوا ہے۔ کپڑا دھویا کچھاڑا جانے لگا۔

چار بجتے بجتے خواتین تشریف لانا شروع کریں گی۔ اب میں کمرہ میں مقید ہو گیا۔ خواتین کے ساتھ ان کی نوکرانیاں، نوکرائیوں کے بچے تعداد کے لئے ہند سے مقرر ہیں۔ ان کی تعداد کے لئے اب تک کوئی ہندسہ دریافت نہ ہو سکا۔ ان کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر محلہ کے گتے، بلی، بکری، مرغی، سب آن پہنچے۔ ان سب نے سارے بھول پودوں کو روند ڈالا۔ خواتین نے پنکھا، پانی، پان، جانماز مانگا اور بیک وقت بولنا، ہنسنا، چیخنا شروع کر دیا اور بیچ بیچ میں سوا پیکڈان کے ہر جگہ پیک ڈالنی شروع کر دی۔ یہ قافلہ یہاں سے اٹھ کر کہیں اور چلا جائے گا۔ وہاں سے کہیں اور، اور میں کلب چلا جاؤں گا۔

(پروفیسر رشید احمد صدیقی)

(آل انڈیا ریڈیو)

شعراء کرام کی خدمت میں ایک خاص گزارش

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

کہا جاتا ہے کہ یہ میر کا شعر ہے، گو اس کے کلیات میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ بہر حال یہ شعر میر کا ہوا کسی اور کا، نہایت پاکیزہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس زمین میں چند اچھی غزلیں نگار کو مل جائیں وہ شعراء کرام جو روایتی غزل گوئی کے نایندہ ہیں ان سے تو خیر مجھے یہ درخواست کرنا ہی ہے لیکن چونکہ اس وقت ہمارے جدید شعراء کو بھی غزل گوئی کی طرف توجہ ہوئی ہے، اس لئے میں ان سے بھی درخواست کروں گا کہ وہ ازراہ کرم اس طرف توجہ فرمائیں اور اخیر جنوری ۱۹۷۷ء تک اپنی غزل مجھے بھیج دیں۔ ارادہ ہے کہ ان غزلوں کو خاص اہتمام سے مع ایک مختصر سے تبصرہ و مقدمہ کے پہلے مارچ ۱۹۷۷ء کے نگار میں اور پھر گلدستہ کی صورت میں علیحدہ شائع کیا جائے اور ممکن ہو تو ہر شاعر کی تصویر بھی دیدی جائے چونکہ دسمبر ۱۹۷۷ء کے بعد اب جنوری، فروری ۱۹۷۸ء ہی کا مشترک نمبر سالنامہ کی صورت میں شائع ہوگا، اور اس دوران میں اس اعلان کی تکرار کا موقع نہ ہوگا۔ اس لئے اس درخواست کو میری آخری درخواست سمجھ کر، توجہ فرمائی جائے تو بڑی عنایت ہو۔ نیاز

”گاہے گاہے باز خواں“

نزاع دیر و حرم

بحث وجدل بجائے ماں، میکدہ جوئے کاندر اں
کس نفس از جمل نہ زد کس سخن از فدک نہ خواست

پیشین گوئیاں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں۔ ایک وہ جو انبیاء و اولیاء کی زبان پر جاری ہوتی ہیں اور دوسری وہ جو علم و تجربہ کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ قسم اول کی پیشین گوئی وحی و الہام ہو یا دور بینی (Foresight) ہمیں اس سے بحث نہیں کیونکہ اول تو پیشین گوئی کر کے والے اب موجود نہیں اور اگر ہوں بھی اس دور تعقل میں کون ان کی سنتا ہے لیکن قسم دوم کی پیشین گوئی ہر صاحب عقل آسانی سے کر سکتا ہے اور اکثر و بیشتر وہ صحیح بھی نکلتی ہے۔ کیونکہ کار و بار عالم مقررہ اصول پر چل رہا ہے اور اسباب و علامات کو دیکھ کر نتائج پر حکم لگانا زیادہ دشوار نہیں

ابتداء آفرینش سے لے کر اس وقت تک انسان نے کہاں کہاں اور کس کس طرح زندگی بسر کی، حیات اجتماعی کے لئے اس نے کیا کیا اصول مقرر کئے، ارتقاء کی کیا صورتیں ہم نے اختیار کیں اور اقوام عالم عروج و زوال کی منزلوں سے کیونکر گزرتی رہیں، یہ اور اسی طرح کے بہت سے موضوع ہیں جن سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ جس وقت کوئی قوم عروج و ترقی سے گزر رہی تھی اس کو کبھی ایک لمحہ کے لئے یہ اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ اسے انحطاط و زوال کی منزل سے گزرنا پڑے گا اور آخر کار ایک دن فنا ہو جائیگی؟ کبھی نہیں دنیا میں سب سے بڑی حکومت جس کی سلطوت و جبروت نے تقریباً تمام کرۂ ارض کا احاطہ کر لیا تھا، سلطنت روم تھی، لیکن آج وہ کہاں ہے؟ چنگیز و ہلاکو جنہوں نے سارے عالم کو لرزہ بر اندام کر رکھا تھا، آج ان کی اولاد کہاں اور کس عالم میں ہے؟ — بابل و سیریا کے حیر العقول تمدن کی بنیاد ڈالنے فرمانرواؤں کے نشانات کیا ان کھنڈروں کے علاوہ کچھ اور ہیں جو اب صرف درندوں کو پناہ دے سکتے ہیں اسی طرح تم فراعنہ مصر، اکاسر و عجم اور دیگر جبارہ عالم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ جب وہ دور ترقی سے گزر رہے تھے تو اپنے کو غیر فانی سمجھتے تھے، لیکن آج جبکہ وہ فنا ہو چکے ہیں ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کبھی تاہل ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی تھے بھی یا نہیں۔

زیادہ نہیں صرف ساڑھے تیرہ سو سال قبل کی بات ہے کہ ایک صحرائشین اُمتی ریگ زار عرب سے پیدا ہوتا ہے اور اپنے بعد ایک ایسے تمدن کی بنیاد چھوڑ جاتا ہے کہ اُس کے جانشین مغرب و مشرق پر چھا جاتے ہیں، لیکن آج اس قوم کا کیا حال اس کے تمدن و تہذیب کا کیا رنگ ہے اور وہ انحطاط کے کس دور سے گزر رہی ہے؟

اسی سخن را چہ جواب ست تو ہم می دانی

لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ کیا اس کا یہ دور ختم ہو گیا ہے اور کیا اس کے انجام کے متعلق حکم لگانا کوئی ایسی پیشین گوئی کرنا ہے جو صرف انبیاء کے لئے مخصوص تھی؟

اگر اقوام عالم کی ترقی اسباب کی محتاج ہے تو ان کے تنزل کو بھی اصولاً اسباب کا پابند ہونا چاہئے اور اس لئے تاریخ عالم کے مطالعہ کے بعد یہ معلوم کر لینا دشوار نہیں کہ ایک قوم کا مستقبل ہمیشہ اس کے حال میں پوشیدہ ہوا کرتا ہے اور مسلمانوں کا جو حال ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

اسلامی تہذیب دنیا کی تمام گزشتہ تہذیبوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی تھی اور وہ حیثیت صرف یہ تھی کہ اُس نے انسانی زندگی کے سامنے ایک ایسا لائحہ عمل پیش کیا جو مادی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاقی ترقی کا بھی ضامن تھا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس کی تمام مادی ترقیاں منحصر تھیں صرف اخلاق کی بلندی پر۔

موجودہ تہذیب میں مادی ترقی کی جو صورتیں نظر آرہی ہیں وہ یقیناً تمام ازمہ گزشتہ سے زیادہ وسیع ہیں لیکن چونکہ اخلاق کا پہلو نظر انداز کر دیا گیا ہے اسی لئے وہ نوع انسانی کو فائدہ پہنچانے کے بجائے اور زیادہ نقصان پہنچا رہی ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ مادی ترقی جو خود ہی نوع انسان کی تباہی کی طرف منجر ہو کبھی صحیح معنی میں ترقی نہیں کہلائی جاسکتی۔

اسلام نے اس توازن کے قیام کے لئے سب سے پہلے جس تعلیم کو پیش کیا وہ یہ تھی کہ تمام انسان برابر ہیں اور دولت کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے جذبہ مساوات و اخوت کو متاثر نہ ہونا چاہئے، پھر یہ تعلیم صرف زبانی نہ تھی یا کسی علمی نظریہ کے طور پر پیش نہیں کی گئی تھی، بلکہ عملاً روز پانچ وقت شاہ و گدا کو پہلو بہ پہلو کھڑا کر کے اس کا درس دیا جاتا تھا۔

جب یہ تعلیم رائج ہو گئی تو ان کو بتایا گیا انسان دنیا میں صرف کام کرنے کے لئے آیا ہے اور اس کو بے کار کبھی نہ بیٹھنا چاہئے، اور اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ دنیا میں ترقی کی جتنی راہیں ہو سکتی ہیں ان سب کو اختیار کرنا چاہئے۔

پھر یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں جو قوم اس اصول پر کاربند ہو وہ کبھی زوال پذیر نہیں ہو سکتی، اور اگر آج مسلمان مہمتی کے عالم میں ہیں تو اس کا سبب سوا اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ اُس نے اس تعلیم کی روح کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اگر یہی حالت رہی تو اس کا فنا ہو جانا بالکل یقینی ہے۔

تعلیم مساوات سے بے خبری و بے تعلقی کا یہ عالم ہے کہ نوع انسانی تو خیر بڑی چیز ہے وہ خود اپنی ہی قوم کا شیرازہ پر اگندہ کر چکے ہیں اور محض فروعی مسائل کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے طیار ہیں عملی زندگی کی کیفیت ہے کہ تقدیر پر پھر دوسرے کے ہاتھ پاؤں ڈال دینا جزو مذہب قرار دیا جاتا ہے اور اس کا اصطلاحی نام صبر و توکل رکھا گیا ہے۔

رہ گیا دنیاوی ترقی میں زمانہ کا ساتھ دینا، سو اس کے متعلق کیا جاسکتا ہے جب کہ ایک زمانہ تک علوم جدیدہ کا حصول کفر کے مترادف سمجھا گیا اور اب بھی ہمارے یہاں کے مذہبی علماء اور قایدین امت اُن سے بالکل نابلدہ ہیں اور نابلدہ رہنے ہی میں اپنی اخروی نجات سمجھتے ہیں۔

پھر غور کیجئے ایسا کیوں ہے؟ تاریخ کے صفحات اٹھا کر دیکھئے کہ مسلمانوں کے زوال کی تاریخ کب سے شروع ہوتی ہے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا اس کی ابتداء علماء مذہب سے نہیں ہوئی اور کیا ذہنی غلامی کی بنیاد ڈالنے والی کوئی اور جماعت تھی؟ بنو امیہ کی سلطنت کو تباہ کرنے والے، بنو عباس کی حکومت کا تختہ الٹ دینے والے یہی لوگ تھے جو شاہان وقت کی ناجائز خواہشوں کی تکمیل کے لئے بھی حدیں گھڑا کرتے تھے اور جنہوں نے صرف طمع نفس کی بناء پر رفتہ رفتہ اسلام کے لٹیر کچر کو اس قدر گندگی سے آلودہ کر دیا کہ آج اس کے صحیح خط و حال کا مطالعہ از بس دشوار ہے۔

پھر ظاہر ہے کہ جب قرون اولیٰ میں اس جماعت کا یہ رنگ تھا تو عہد حاضر میں اس کی بے خبری کا کیا عالم ہوگا اور جو قوم اپنا مستقبل

ان کی تعلیم و ہدایت پر منحصر رکھے گی اس کی تباہی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

یقیناً اس وقت تمام دنیا کے مسلمان ایک رشتہ سے وابستہ نہیں ہیں اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے، لیکن اس کا علاج پان اسلام نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق صرف احساس وطنیت سے ہے۔

ہندوستان میں صدیوں تک قیام کرنے کے بعد یہ اجنبیت کیوں؟ اس کا سر رشتہ بھی علماء مذہب کے ہاتھ میں ہے جنہوں نے سرزمین ہند کو دارالحرب و کفرستان اور یہاں کے رہنے والے کو ہمیشہ کافر کہہ کر اختلاف و دشمنی کی وسیع خلیج حایل کر دی، درنہا ایک ہندوستان کفرستان ہے اور ہندو کافر و مشرک۔

ایک ہندو مندر میں جا کر بت کے سامنے جھک جاتا ہے تو کافر ہے لیکن ایک مسلمان مسجد میں جا کر محراب کے سامنے سربسجود ہو جاتا ہے تو کافر نہیں، ایک ہندو پتھر کی مورتی کو بوسہ دیتا ہے تو مشرک ہے، لیکن ایک مسلمان طواف کعبہ کے وقت سنگ اسود کو چومتا ہے تو مشرک نہیں۔ کیوں؟

اگر مسلمان کے یہ مذہبی مراسم خالصتہً للہ ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندو کا مقصود اس سے علیحدہ ہو۔ اگر ایک مسلمان سنگ اسود کو صرف اس لئے چومتا ہے کہ وہ ایک بڑے شخص کی یادگار ہے تو آپ کیوں یقین کریں کہ بتوں کی پرستش کسی اور جذبہ کے تحت کی جاتی ہے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کون سا ہندو ہے جو بتوں کو خدا سمجھ کر ان کی پوجا کرتا ہے اور اگر بعض جاہل افراد ان میں ایسے ہیں تو پھر ان مسلمانوں کو کیا کہا جائے گا جو قبروں کی خاک چاٹ چاٹ کر تعزلیوں اور مقبروں کی جالیوں میں منت کی دھجیاں باندھ باندھ کر ہندوؤں سے زیادہ کفر و شرک میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

بہر حال مدعا یہ ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی آبادیوں میں تفریق و اختلاف کا سبب صرف مذہب کی وہ غلط تعبیر ہے جو ہندوستان دونوں کے علماء مذہب کی طرف سے پیش کی گئی اور اب بھی پیش کی جا رہی ہے۔

اس لئے اگر ہندوستان کی ترقی و آزادی کے لئے ہندو مسلمان کا اتحاد ضروری ہے تو سب سے پہلے دونوں جماعتوں کو مذہبی تعصب ترک کر کے اپنا شعار صرف انسانیت کی پرستش قرار دینا چاہئے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہندوؤں کی گرفت سے ہندو اور علماء کے چنگل سے مسلمان آزاد ہو جائیں۔

دیکھئے

سالنامہ ۱۹۵۲ء کے لئے چھ آنے کے ٹکٹ بھیجنا نہ بھول جائیے۔ ورنہ ہم اس کے محفوظ پہونچنے کے ذمہ دار نہ ہوں گے اور اس کے کم ہو جانے کی صورت میں دوبارہ ہم اسے مفت فراہم نہ کر سکیں گے۔

منیجر

باب الاستفسار

واقعہ اصحاب فیل

(جناب محمد عبدالعزیز فتح محمد - مالیکاؤں)

قرآن مجید کے تیسویں پارہ میں اصحاب فیل کا ذکر ہے۔ اس واقعہ پر تاریخی حیثیت سے روشنی ڈالنے اور اس کے متعلق جو عام روایات پائی جاتی ہیں ان کی بابت بھی رائے ظاہر کیجئے۔

(نگارہ) قرآن مجید میں "اصحاب فیل" کا ذکر سورہ فیل میں اس طرح کیا گیا ہے:-
 "الم تر کیف فعل ربک باصحاب الفیل - الم یجعل کیدہم فی تضلیل وارسلہم طیراً

ابابیل - ترسیہم بحجارة من سجيل - فجعلہم کصف ماکول۔"

(کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے اصحاب فیل کے ساتھ کیا کیا۔ کیا ان کی لڑائی کو ناکام نہیں بنا دیا۔ اور بھیجیں چڑیاں جھنڈ کی جھنڈ ان پر جنہوں نے سخت پتھروں سے ٹکڑا ٹکڑا ٹکڑوں نے کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا) اس سورت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب ابرہہ نے (جو یمن میں شاہ حبش کا نائب تھا) مکہ پر حملہ کیا تھا۔ ابرہہ نے ضحاک (مین) میں ایک عظیم الشان کلیسا طیار کرایا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اہل عرب اسی طرف مایل ہوں اور مکہ چھوڑ کر ضحاک کو اپنا روحانی و تجارتی مرکز قرار دیں۔ چنانچہ اس نے مکہ پر حملہ کر دیا تاکہ خانہ کعبہ کو تباہ کر کے عربوں کے مذہبی مرکز کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے۔ پھر چونکہ فوج میں چند ہاتھی بھی تھے، اس لئے اہل عرب نے اس فوج کا نام "اصحاب الفیل" رکھ دیا۔ یہ واقعہ ۵۷۰ء عیسوی کا ہے (غالباً مارچ، اپریل) اور رسول اللہ کی ولادت ۵۷۰ء میں ہوئی جو پہلا "عام فیل" کہلاتا ہے۔

جس وقت عربوں کو اس حملہ کا علم ہوا تو انھوں نے بہت کوشش کی کہ ابرہہ اس خیال سے باز آجائے لیکن وہ نہیں مانا اور فوجوں نے بڑھنا شروع کیا۔ جب ابرہہ، مکہ سے صرف تین دن کی مسافت پر رہ گیا تو عبدالمطلب نے کعبہ کا دروازہ پکڑ کر اس مصیبت سے بچنے کی دعا کی اور تمام مکہ کی آبادی اس دعا میں ان کی شریک ہوئی۔ پھر اس کو دعا کا اثر کہئے یا محض اتفاق کہ اسی وقت ابرہہ کی فوج میں ایک وبائی بیماری پھیل گئی جس سے فوج کا بڑا حصہ ہلاک ہو گیا اور جو لوگ بچ رہے تھے وہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ واقعہ، ہشام اور دوسرے مورخین نے لکھا ہے کہ یہ بیماری چیچک کی تھی، لیکن بعض مفسرین نے عجیب عجیب بے سرو پا باتیں بیان کی ہیں مثلاً یہ کہ لاکھوں چڑیوں نے اپنے پنجوں اور چونچ سے ابرہہ کی فوج پر کنکر پتھر برسائے شروع کئے اور بھوسے کی طرح ان کو روند ڈالا اس قسم کی روایتیں، آخری "تین آیتوں" کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ قرآن میں کسی بیماری کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس وبا کے بعد جو لاشیں پڑی رہ گئی تھیں ان کا حال بتایا ہے کہ چڑیوں نے جن سے مراد غالباً گدے اور چیل وغیرہ ہیں، انھوں نے ان کو

پتھر لی چٹانوں پر گھسیٹ گھسیٹ کر فوجنا شروع کر دیا اور ان کو قیمہ قیمہ کر دیا۔
 ابابیل سے وہ چڑیا مراد نہیں ہے جسے ہم ہندوستان میں ابابیل کہتے ہیں بلکہ ابابیل کے معنی جھنڈے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ جب
 لاشیں بہت ہوں گی تو گدہ اور چیلین کثرت سے جمع ہو جائیں گی اور یہی مراد طیر ابابیل سے ہے۔

صُرف، صُرفہ اور صرف کی تحقیق

(ایک صاحب - راولپنڈی)

جولائی کے پرچہ میں وحشت صاحب پر مضمون پڑھا، ان کا ایک شعر ہے:-
 جنوں انگیزیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں اس کے گیسو کی
 بہت سے ہاتھ اب صرف گریباں ہوتے جاتے ہیں
 اس پر آپ کا یہ ارک ہے کہ "صرف گریباں" محل نظر ہے۔ ذیل کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے:-
 رکن زکین عرش نے فوج کا علم کعبہ فلک پہ صرف طواف شہ ام (دبیر)
 نہیں عیب کچھ ان میں اور بھی حسرت تو ہم لوگ ہیں صرف آگاہ خوبی (حسرت)
 ان اشعار میں "صرف" قریباً اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

(نگار) وحشت کا شعر آپ نے صحیح نقل نہیں کیا۔ "بڑھتی چلی جاتی" نہیں بلکہ "بڑھتی چلی" ہے۔ جاتی بڑھا دینے سے مصرع ناموزون
 ہو جائے گا۔ اور حسرت کے شعر میں آپ نے صرف (بہ معنی محض) کو صرف (بفتح صاد) پڑھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو صرف اور آگاہ دوڑ
 کو کسرہ کے ساتھ پڑھنا پڑا حالانکہ "صرف آگاہ خوبی" کے کوئی معنی نہیں۔

دبیر نے البتہ لفظ صرف استعمال کیا ہے اور بالکل صحیح استعمال کیا ہے۔ صرف عربی کا لفظ ہے جس کے متعدد معنی ہیں:- توبہ، حیلہ،
 زیادتی، لوٹا دینا، واپس کرنا، اور خرچ کرنا وغیرہ۔ لیکن فارسی شعرا نے ان معنی میں اس لفظ کا استعمال نہیں کیا۔ وہ صرف کی جگہ صرفہ،
 فائدہ و فرصت کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ اور بخل یا تنگی اور غالب آجانے کے معنی میں بھی۔
 فارسی میں صرفہ کا استعمال مختلف حروف صلوٰۃ کے ساتھ مختلف معنی میں ہوتا ہے۔ مثلاً (فرصت کے معنی میں)

خندہ شوخ تو فرصت بہ تغافل نہ دہد

دلف در بردن دل صرفہ بکا کل نہ دہد

(بازی لیجانے اور غالب آجانے کے معنی میں) حافظ کا شعر ہے:-

ترسم کہ صرفہ نہر و روز باز خواست

نان حلال شیخ زآب حسام

مکن صرفہ سے، باسرافت کوشش

نم از تست چنداں کہ خواہی بنوشش

(صلوٰۃ یا مشتقات داشتن کے ساتھ)

(صلوٰۃ زاء مشتقات بردن کے ساتھ)

(تنگی کے معنی میں) طالب علی لکھتا ہے:-

(یعنی شراب پینے میں تنگی (صرفہ) نہ کر، خوب پی کیونکہ خم تیرا ہے)
 اُردو میں بھی صرفہ کا استعمال فائدہ اور بخل کے معنی میں ہوا ہے۔ داغ کا شعر ہے:-
 نہ کراے چارہ گر ناحق کا صرفہ (بخل) نہ ہر دینے میں
 جو مرنے کے نہیں قابل تو کیا جینے کے قابل ہوں

اُردو میں بے صرفہ بے معنی بے فائدہ اکثر اساتذہ نے استعمال کیا ہے۔

اب لفظ صرف کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ اُردو والوں نے اس کا استعمال دو طرح کیا ہے، ایک بغیر کسی ترکیب کے بے معنی خرچ اور
 دوسرے ترکیب اضافی کے ساتھ جیسے صرف طواف۔ صرف غم، صرف ماتم وغیرہ اور ان ترکیبوں میں صرف کے معنی وقف ہو جانے یا
 کسی کام میں لگ جانے کے ہیں جو غالباً ”خرچ ہونے“ کے مفہوم سے لیا گیا ہے۔
 میں نے وحشت کے شعر میں ”وقف گریباں“ کو محل نظر اس لئے ظاہر کیا کہ مشغول ہونے یا وقف ہو جانے کے لئے کسی کیفیت، کام
 یا مشغلہ کا پایا جانا ضروری ہے اور محض گریباں نہ کوئی کیفیت ہے نہ مشغلہ۔ ہاں اگر ”صرف گریباں درسی“ کہا جائے تو صورت مشغلہ
 کی پیدا ہو سکتی ہے۔

بعض اساتذہ نے صرف کا استعمال بہ صورت اضافت اسم کے ساتھ بھی کیا ہے:-

مثلاً: آخر گل اپنی صرف درمیکدہ ہوئی

پہونچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

در اسم ہے، کوئی فعل! کیفیت نہیں، لیکن یہاں ”کام میں آ جانے کے“ کا مفہوم بالکل کھلا ہوا ہے، برخلاف اس کے وحشت
 کے شعر میں ”صرف گریباں درسی“ مراد لینا، تکلف سے خالی نہیں۔ اس لئے میں نے اسے محل نظر کہا غلط نہیں کہا۔
 لفظ صرف (بکسرہ صاد) جسے حسرت نے استعمال کیا ہے، عربی ہے جس کے معنی خالص کے ہیں اور اسی لئے فارسی میں خالص شراب
 کو جس میں اور کچھ نہ ملا ہو، صرف کہتے ہیں۔
 میرزا صاحب کہتے ہیں:-

مئے مزوج را از صرف بہتری تو اں خوردن

زیاد از چشم باشد فیض لعل آبدار او

اُردو میں بھی اس کا استعمال اسی معنی میں ہوتا ہے:- (خالص، تنہا، محض)۔

تذکرہ معرکہ سخن

اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے جس میں تمام ان اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو شعراء فارسی و اُردو کے کلام پر کئے گئے ہیں اور
 اسی کے ساتھ اعتراضات کے جوابات بھی دئے گئے ہیں اور ان پر مباحثہ بھی کیا گیا ہے۔ جن شعراء کا اُس میں ذکر کیا گیا ہے ان کے حالات بھی دیدئے
 گئے ہیں، وہ حضرات جو فن شعر کے نکات و رموز سے واقف ہونا چاہتے ہیں، ان کے لئے یہ کتاب بڑا بیش قیمت ذخیرہ ہے۔ صرف چند جلدیں باقی
 رہ گئی ہیں۔ قیمت معہ محصول چار روپیہ آنے۔

فیجرنگار لکھنؤ

دنیا کی ایک طلسمی گھڑی

(ریاضی، ہیئت اور میکا کی عجائب کا مجموعہ)

گھڑی کی ایجاد اور اس کی ترقی کی داستان بہت دلچسپ ہے۔ گھڑیوں کی ایجاد سے قبل وقت کی تقسیم اجرام سماوی اور سایہ کو دیکھ کر کیا کرتے تھے یعنی جب چاند اپنا چکر زمین کے گرد ختم کر لیتا تھا تو اسے عینہ کہتے تھے اور جب زمین اپنا چکر سورج کے گرد پورا کر لیتی تھی تو اس کو سال سے تعبیر کرتے تھے اور دن سے مراد وہ وقت تھا جو زمین کو اپنے محور پر گردش کرنے میں صرف ہوتا تھا۔

اب رہ گئی اس سے بھی چھوٹی تقسیم گھنٹوں یا ساعتوں کی سو اس کے لئے وہ دن میں درختوں کے سایہ سے اور رات کو سیاروں کی رفتار سے مدد لیتے تھے۔ انسان نے کتنے عرصہ تک وقت کی تقسیم کا حساب اس طرح رکھا کہ اس کی تعیین دشوار ہے لیکن یہ یقینی ہے کہ سب سے پہلی گھڑی جو اختراع ہوئی وہ ”دھوپ گھڑی“ تھی۔ جس کا ۲۲ سال قبل مسیح رواج پایا جاتا تھا اور غالباً کلدانی تہذیب کا ورثہ تھی۔

یونان میں بھی دھوپ گھڑی کلدانیہ ہی سے پہونچی اور پھر اس کی صنعت میں کس کس تفسن سے کام لیا گیا۔ چنانچہ بعض اتنی بڑی بنائی گئیں کہ بقول بعض، اہرام مصری بھی دھوپ گھڑی ہی ہیں جن کے سایہ سے تعیین وقت ہوا کرتی تھی اور بعض اتنی چھوٹی طیار کی گئیں کہ انگوٹھی میں لگینہ کا کام دیتی تھیں۔

لیکن چونکہ دھوپ گھڑی صرف دھوپ میں کام دے سکتی تھی اور ابرو باد کے موسم میں وہ بیکار تھی اس لئے بعد کو لوگوں کا خیال پانی کی گھڑی کی طرف منتقل ہوا، اس کی صورت یہ تھی کہ دو برتن لئے جاتے تھے ان میں سے ایک کے اندر پانی بھر دیا جاتا تھا اور اس کے پینڈے میں بارہک سوراخ ہوتا تھا جس سے پانی ٹپک کر دوسرے برتن میں جاتا تھا۔ اس برتن کے چاروں طرف متعدد خطوط منقوش ہوتے تھے جن سے پتہ چلتا کہ پانی کس خط تک پہونچا اور کتنا وقت گزر گیا۔ بعد کو اس میں کچھ جہتیں بھی کی گئیں یعنی پہیے بھی لگا دئے گئے جو پانی کے دباؤ سے گھومتے تھے اور ایک پہیہ کی سوئی جو پہیہ کے ساتھ آہستہ آہستہ گھومتی تھی اور وقت بتاتی تھی۔

پانی کی گھڑی کے موجد اہل مصر ہیں اور حسب بیان وٹرووس، اسکندریہ کے ایک حجام نے ۲۲۵ سال قبل مسیح اس کو ایجاد کیا تھا۔ اسکے اس کے بعد جب افلاطون، مقصر آیا تو یہاں سے پانی کی گھڑی اپنے ساتھ یونان لے گیا اور وہاں خود اپنے ہاتھ سے ایسی گھڑی طیار کی جس میں ہر گھنٹہ ختم ہونے کے بعد ستار بجتا تھا۔

اہل عرب نے گھڑی سازی کے فن میں بڑی محنت و ذہانت سے کام لیا، چنانچہ وہ گھڑی جو ہارون الرشید نے ۸۰۰ء میں فرانس کے بادشاہ شارلمان کے پاس بھیجی تھی بہت مشہور تاریخی گھڑی سمجھی جاتی ہے۔ یہ بھی پانی کی گھڑی تھی اور تانبے کی لیکن اس پر طلا کا کام تھا۔ اس میں بارہ چھوٹی چھوٹی گھڑیاں تھیں جن میں سے چھوٹے چھوٹے معدنی گیند گڑ گڑ کر گھنٹا بجاتے تھے جب اس کی باروں گھڑیاں کھل جاتی تھیں تو ان میں سے سوار نکلتے تھے اور چاروں طرف چکر لگا کر پھر اندر داخل ہو جاتے تھے اور گھڑیاں بند ہو جاتی تھیں۔

پانی کی گھڑی کے بہت زمانہ بعد ”ریت گھڑی“ ایجاد ہوئی، یعنی بجائے پانی کے ریت بھر دی جاتی تھی اور وہ سوراخ سے آہستہ آہستہ گرتی تھی۔ اس کے موجد بھی اہل مصر ہیں۔

انگلستان میں شمعوں کے ذریعہ سے تعین اوقات کی جاتی تھی۔ روزانہ چھ شمعیں روشن کی جاتی تھیں جن میں سے ہر ایک بارہ اونچ کی ہوتی تھی۔ ان شمعوں کے بدنے اور اُس کی بتی کاٹنے کے لئے دو راہب مقرر ہوتے تھے جو اپنی انگلیوں سے بتی کاٹتے تھے دقینچی کا رواج اس وقت تک نہ ہوا تھا) یہ شمعیں سینک کے اندر روشن کی جاتی تھیں تاکہ ہوا سے گل نہ ہوں۔ فانوس کے اندر رکھ کر جلانے کا رواج بعد کو پیدا ہوا۔ موجودہ پہیہ رکھنے والی گھڑیوں کی ایجاد کب ہوئی۔ یقین کے ساتھ بتانا مشکل ہے بعض کہتے ہیں کہ یہ دو سو سال قبل مسیح ایجاد ہو گئی تھی۔ بعض کا خیال ہے کہ ۱۷۵۰ء میں ایک شخص مٹیوس نے ایجاد کی۔ اور بعض کی تحقیق یہ ہے کہ ۱۸۵۰ء میں ایک راہب باسیوکیوس نے اس کو اختراع کیا۔

تیرھویں صدی عیسوی تک اس صنعت میں کافی ترقی ہو گئی، چنانچہ اہل عرب نے بعض ایسی گھڑیاں طیار کر کے خلفاء مصر کے سامنے پیش کیں جو نہایت مکمل تھیں، یہی گھڑیاں بعد کو فریڈرک ثانی کے پاس پہونچیں اور اسی وقت سے اطالیہ میں پہیہ والی گھڑیاں بعد کو فریڈرک ثانی کے پاس پہونچیں اور اسی وقت سے اطالیہ میں پہیہ والی گھڑیاں بننا شروع ہوئیں جس کا تتبع انگلستان میں بھی کیا گیا چنانچہ اوورڈ اول کے زمانہ میں کسی راہب نے جو لوہار کا لڑکا تھا ایسی گھڑیاں طیار کیں جو گھنٹوں کے علاوہ شمس و قمر کی گردش اور اوقات بد و جزر کو بھی بتاتی تھیں۔ اس کے بعد ۱۳۲۵ء میں ایک اور راہب نے ایسی گھڑی بنائی جو سیاروں کی گردش بھی بتاتی تھی۔ اس میں دو پہیے نصب تھے جو گھنٹہ بجاتے تھے۔

۱۳۲۴ء میں ویتس کے ایک آدمی نے ایسی گھڑی بنائی جو نہ صرف شمس و قمر اور سیاروں کی حرکت کو ظاہر کرتی تھی بلکہ سال کے تمام تہواروں کو بھی بتاتی تھی۔

گھڑی میں پنڈولم یا رقاس کا استعمال سترھویں صدی عیسوی سے ہوا ہے بعض کہتے ہیں کہ اس کے موجد اہل عرب ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ وہ کوئی فرنگی تھا لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس کے موجد اہل عرب تھے۔ لیکن ترقی دی اس کو اہل فرنگ نے۔ ۱۸۸۰ء میں نیویارک کے ایک شخص نے ایسی گھڑی بنائی جو ۸ فٹ لمبی، ۸ فٹ چوڑی اور ۵ فٹ گہری تھی۔ اس میں دو ہزار پہیے تھے۔ اس کے اوپر واشنگٹن کا مجسمہ بنایا گیا تھا اور بہت سے دوسرے مجسمے ایسے تھے جو علاوہ وقت کے گردش شمس و قمر اور فلک جابانے کیا کیا ظاہر کرتے تھے۔

موجودہ ساخت کی جیپی گھڑی بیضاوی شکل کی سب سے پہلی ۱۶۹۰ء میں طیار ہوئی اور ایک شخص پیرس پہلی نے اسے طیار کیا تھا۔ اس قسم کی گھڑیوں میں صرف ایک سوئی ہوتی تھی جو دن میں دو یا تین مرتبہ گردش کرتی تھی۔ سترھویں صدی میں کمافی ایجاد ہوئی اور جیپی گھڑیاں زیادہ اچھی بننے لگیں۔ اس وقت سب سے زیادہ اچھی گھڑیاں وہ ہیں جو کروٹو گران یا کروٹو میٹر کہلاتی ہیں اور رصدگاہوں میں استعمال ہوتی ہیں۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس فن کی ترقی اسی جگہ آ کر رک گئی۔ انسانی دماغ کبھی بیکار نہیں رہتا وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ نئی بات سوچتا ہی رہتا ہے، چنانچہ اس فن میں بھی اس کی نکتہ آفرینیاں برابر جاری ہیں، یہاں تک کہ حال ہی میں ڈنمارک کے ایک انسان نے جس کا دماغ، ریاضی، ہیئت اور میکائیک کے نکات کا خزانہ تھا ایک ایسی گھڑی طیار کی جس کو اگر طاسم و معجزہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

اس کا موجد کوپن گین (ڈنمارک) ایک باشندہ "jensolson" تھا جس نے اپنی ساری عمر کی کوشش کے بعد ۱۹۴۲ء میں ایک ایسی گھڑی بنائی جس کا تصور بھی کوئی نہ کر سکتا تھا۔ یہ شخص ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوا اور ہوش سنبھالتے ہی گھڑی سازی کا پیشہ اختیار کیا، لیکن وہ موجودہ گھڑیوں سے کچھ مطمئن نہ تھا اس لئے اس نے سیاحت شروع کی اور مختلف ملکوں میں جا کر وہاں کی گھڑیوں کی ساخت کا مطالعہ کیا، اسی سلسلہ میں اسٹراسبورگ پہونچا جہاں ایک اتنا صحیح وقت بتانے والی گھڑی پائی جاتی ہے

کہ سو سال میں آٹھ سکند سے زیادہ فرق نہیں ہوتا

یہاں سے لوٹ کر وہ اپنے ذہنی خاکہ کو سامنے رکھ کر ایک گھڑی بنانے میں مصروف ہو گیا لیکن اس کا تصور گھڑی کے متعلق کیا تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۳۰ سال کے عرصہ میں وہ صرف اس کے نقشے طیار کر سکا، جن کی تعداد ۲۷۶ تھی۔

۱۹۳۴ء میں ایک کمیٹی نے اس گھڑی کے بنانے کے لئے چندہ جمع کرنا شروع کیا اور دس سال کے اندر جب یہ رقم ساڑھے بارہ لاکھ تک پہنچ گئی تو اس نے کام شروع کیا، لیکن ابھی یہ کام ختم نہ ہوا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ اگر یہ شخص مشرق میں پیدا ہوتا تو اس کے ساتھ ہی لوگ کے تصورات کو بھی بھول جاتے، لیکن وہ ایک زندہ قوم کا فرزند تھا اس لئے وہاں کے ایک انٹیلی ٹیوٹ نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کے بتائے ہوئے نقشوں کو سامنے رکھ کر آخر کار وہ گھڑی طیار کر ہی لی جو بالکل ایک طلسم زار کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ گھڑی آٹھ فیٹ اونچی، ۱۰ فیٹ چوڑی اور ۲۱ فیٹ گہری ہے۔ اس کے دس ڈائل ہیں اور ہر ڈائل سے مختلف معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس کی ایک سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تین ہزار سال میں وہ ۳۳ سکند سے زیادہ وہ سست نہ ہو سکے گی۔ اس کی مشینری گیارہ حصوں میں تقسیم ہے جن کے پیرزوں اور پہیوں کی تعداد ۵۰ ہزار ہے۔ یہ تین ہزار سال تک برابر کام دیتی رہے گی اور بجز اس کے کہ ہر ہفتہ اسے گونا گونا اور کبھی کبھی اس میں تیل ڈالنا پڑے گا، اس میں ہاتھ لگانے کی ضرورت نہ ہوگی۔

تاریخ و دن کے علاوہ اس سے تمام دنیا کے اہم مقامات کے اوقات (معمولی گھڑیوں اور دھوپ گھڑیوں دونوں حساب سے) معلوم ہو سکیں گے، دنیا کی مختلف بارہ تقویموں یا جنتریوں کے حساب سے ہر ایک کی تاریخ علحدہ علحدہ معلوم ہو سکے گی، یہ چاند کا گھٹنا بڑھنا، ستاروں کی گردش، کواکب ثابہ کا صحیح مقام اور اوقات بروز کو بھی ظاہر کرے گی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ چاند اور سورج میں کہاں کہاں کن تاریخوں میں کتنا گہن پڑے گا، یہ ہر چھ تھے سال اور ہر چار صدی کے بعد فروری چھپنے کے ۲۸ یا ۲۹ دن ہونے کو بھی بتائے گی، یہاں تک کہ زمین کی اُس گردش کو بھی ظاہر کرے گی جو وہ ۵۳، ۲۵ سال میں ایک بار قطب شمالی کے گرد کرتی ہے۔

الغرض یہ گھڑی موجودہ زمانہ کی غیر معمولی ذہانت کا بڑا عجیب و غریب کرشمہ ہے جس سے کم از کم تین ہزار سال تک خدا جانے کتنی انسانی نسلیں فائدہ اٹھاتی رہیں گی۔

خریدارانِ نگار کے لئے

ایک نہایت ضروری اعلان

اگر آپ کا چندہ دسمبر ۱۹۵۳ء میں ختم نہیں ہوتا تو سالانہ ۱۹۵۳ء ذریعہ دی۔ پی جائے گا اور آپ کو یقیناً مل جائے گا

لیکن

اگر آپ کا چندہ دسمبر ۱۹۵۳ء میں ختم نہیں ہوتا

تو سالانہ ۱۹۵۳ء کے لئے چھ آنے کے ٹکٹ ضرور بھیج دیجئے تاکہ ذریعہ رجسٹری روانہ کیا جائے۔ ورنہ اگر وہ کم ہو گیا (جس کا قوی اندیشہ ہے) تو ہم دوبارہ مفت روانہ نہ کریں گے۔ کیونکہ دنیا کا کوئی اخبار یا رسالہ اصولاً اس کی ذمہ داری نہیں لیتا کہ پرچہ کم ہونے کی ضرورت میں وہ دوبارہ مفت فراہم کرے گا۔

سالانہ ۱۹۵۳ء کے لئے چھ آنے کے ٹکٹ رجسٹری کے لئے آنا بالکل ضروری ہیں۔

منبر

خدا کے حضور میں

ابلیس :-

یہ غم آلودہ و مایوس نگاہیں کیسی ؟
 کھا گیا تجھ کو مگر حضرت انسان کا سوگ
 یاد ہوئی تجھے جنت کی مگر وہ گھری رات
 چور زخموں سے ہے گو روح گد مند مری
 کچھ مناسب نہ تھا آدم کا سرخاک نزول
 بیج تو یہ ہے کہ خلافت کا سزاوار نہ تھا
 اپنے ہی "طور" کا سیاد ہے تیرا "کلیم"
 آہ ! یہ سایہ فسد ایہ سراب امروز
 خون ہی خون ہے بھیگی ہوئی برساتوں میں
 رنگ میں ڈوب گیا آئینہ قلب و نظر
 مجھ کو اک سجدہ آدم بھی گوارا ہوا
 پتنگری اصل میں تھی، بت شکنی بھی اس کی
 دہن کے نام کو پندام کیا ہے اس نے
 اس کے جرموں پہ ہے دستار و عمامہ کا غلام
 حور و جنت کو لپکتی ہے فقط اس کی کند
 پر ہیں ساراں تباہی سے دکائیں اس کی
 کفر و عصیان کے لئے اس کا وجود این جن ہے
 یہ ہوا بن کے چراغوں سے رہا گرم ستیز
 قصر تو حید پہ ڈھائے ہیں ستم خود اس نے
 گمراہی کو مری خود اس نے دکھائے ہیں چراغ
 بجھ چلے تھے مری رنگین سیاست کے دئے
 غم دنیا سے فراغت نہیں ہر چند مجھے
 اب یہ جلوہ نہیں تکلیف بصارت مجھ کو
 لطف منظر ہے جہاں تک بھی نظر جاتی ہے
 صبح کے بعد ذرا سلسلہ شام بھی دیکھ !

خالق کل ! ترے ہونٹوں پہ یہ آپس کیسی ؟
 یعنی غم خاندان سوت کا بڑھتا ہوا روگ
 تو نے ٹھکانی کتنی جب خادم دیرینہ کی بات
 شکر ہے چشم جہاں میں تو نہیں بند مری
 تو ابھر کر نہ سکا اپنی لوح مبدول
 یہ ترے لطف و عنایت کا سزاوار نہ تھا
 میں ہی کیوں مورد الزام ہوں لے رب کریم !
 یہ کعبہ خاک ہے مجھ سے بھی زیادہ پر سوز
 زہر ہی زہر سیاہی کا جواں راتوں میں
 اپنے سورج سے گریزاں ہے یہ دنیا کی سحر
 اور یہ بندوں کو خدا کہہ کے موقد ہی رہا !
 ایک دھوکا تھا فوائے ازلی بھی اس کی
 تیرے قرآن کا نیلام کیا ہے اس نے
 اس کے طوفان سے ہے کتنے سفینوں میں شکان
 پاسبانی ترے کعبے کی کہاں اس کو پسند
 کتنی بے سوز ہیں خوش لحن اذانیں اس کی
 "مذہب ختم رسل شعلہ بہ پیراؤں ہے
 اس کے آغوش میں پلتے رہے کتنے چنگیز
 سنگ کعبہ سے تراشے ہیں ستم خود اس نے
 میں نے خود اس کے چراغوں سے جلائے ہیں چراغ
 اس نے خود کو ششیں کیں میرے مقاصد کے لئے
 پھر بھی آدم نے دیا ذوق سکون مند مجھے
 ہر کہانی نظر آتی ہے حقیقت مجھ کو
 مجھ کو زخموں سے بھی پھولوں کی جھلک آتی ہے
 حسن تخلیق کا دنیا میں یہ انجام بھی دیکھ !

فضا ابن فیضی

ہو چلی عام زمانے میں شریعت میری
 اب نہیں محفل ہستی کو ضرورت میری

(سید اختر علی اختر تلہری)

باتوں پہ مری ہنستا ہے تو واعظ ناداں
تضحیک ہے تکفیر ہے ارباب خرد کی،
ہوں جیسے ترے پاس حقیقت کے قبائے
ہیں تیری شریعت کے یہ انداز نرا ہے

مذہب تو بہت خوب ہے لیکن واعظ
بے سود مباحث ہیں ترے دین کا حاصل
مذہب زدگی سے تری عاجز ہیں خرد مند
تکفیر پر ارباب نظر کی ہے تو خور سند

سجد ہائے بے ریا کے بعد با سوز و گداز
مجھ کو دنیا کر عطا دنیا کریم ذوالمنن،
یہ گلستاں آفریں چہرے یہ گیسو دلنواں
آج کی عشرت کو چھوڑ دوں کل کی عشرت کیلئے
یہ دعا کرتے تھے رات اک واعظ منبر نشین
رہنے دے تو اپنی حوریں اپنا فردوس بریں
یہ لئے آنکھوں میں میخانے بتان ہندوچیں
میرے مولا مجھ سے یہ ممکن نہیں ممکن نہیں

(جگر بریلوی)

دل نہ دیوانہ ہو یہ اُس کو گوارا بھی نہیں
جان بیتاب سی رہتی ہے کہ ہو جائے تشار
زخم بڑھتا بھی نہیں فیصلہ جس سے ہو جائے
بے حجابی بھی نہیں وہ کہ جو ہوش اڑ جائیں
پاؤں رکتے ہی نہیں آپ بڑھے جاتے ہیں
شکوہ جور تو کرتے ہیں مگر سچ یہ ہے
لطف ہم پر ہو جگر تم نے یہ چاہا بھی نہیں،

بکلی تھے ڈھونڈنے کسی رشک فخر کو ہم
وہ بھی اُدھر ہی گھوم کے آتا ہے سامنے
یہ شام کا سکوت یہ کیفیت نیاز
جیسے کسی کے در پہ جھکائے ہوں سر کو ہم
ناگاہ پاس گئے دل وحشت اثر کو ہم
جاتے ہیں اُس سے پھیر کے منہ اب جدھر کو ہم

دیوار و در کے راز سے آگاہ ہے جگر
زمین بنائیں گے اسی شوریدہ سر کو ہم

شاد تمکنت :-

تلخی صہبائے غم کا تذکرہ پھر تازہ ہو آج اپنے ظرف کا ہر رند کو اندازہ ہو
 نہ جانے کیوں طبیعت ہو گئی اپنوں سے بیگانہ ترے غم کی بدولت بے نیازی بڑھ گئی اپنی
 آنکھ اور منہستی رہے وقت وداع دوست پر اس وفور ضبطِ کامل کو کہاں تک روئے
 تری آواز ہے یا زندگی تقسیم ہوتی ہے طرب گاہِ ازل سے یا صدائے بازگشت آئی
 ہیں کچھ ایسے رازِ غم جو حسن پر ظاہر نہیں آہ ان اسرارِ حائل کو کہاں تک روئے
 نہ جانے کیا مری مجبوریوں نے سمجھا یا کہ اب اُداس ہوں لیکن بہت اُداس نہیں
 گلہ گزار نہیں اجتناب کا ترے ہے یاد مجھ کو وہ کم کم سپردگی تیری
 آنکھ — جیسے کوئی چینے کی قسم دیتا ہو گفتگو — جیسے سنوارے کوئی قسمت میری

جگن ناتھ آزاد :-

فضا کو دیکھ کے ذوقِ نظر پہ کیا گزری نہ پوچھے ہوسِ بال و پر پہ کیا گزری
 تمہیں کچھ اس کی خبر بھی ہے اے چمن والو سحر کے بعد نسیمِ سحر پہ کیا گزری
 یہ کاش تجھ کو بھی ذوقِ نظر بتا سکتا تری تلاش میں ذوقِ نظر پہ کیا گزری
 شکستہ شیشہ جو پھر شیشہ گر سے جڑ نہ سکا خبر نہیں کہ دلِ شیشہ گر پہ کیا گزری
 حضورِ دوست کا عالم بتا نہیں سکتا میں کیا کہوں مرے قلبِ جلّیہ کیا گزری

نظر تو مجھ غمِ جستجو تھی اے آزاد

یہ اس کے ساتھ دلِ بے خبر پہ کیا گزری

مطبوعات موصولہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو کاپیاں بھیجنا چاہئے)

بیکران دوسرا اڈیشن ہے جس میں آئندہ آزاد کی طرلوں اور نظموں کے مجموعہ کا جسے مکتبہ شاہراہ دہلی سے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے اور اس لحاظ سے کہ اس میں کچھ چار سال کا وہ کلام بھی شامل ہے جو پہلے اڈیشن میں شامل نہ ہو سکتا تھا، زیادہ مکمل مجموعہ ہے۔ ابتدا میں فراق گورکھپوری نے آزاد کے شاعرانہ خصوصیات پر مختصر لیکن بڑی جامع رائے دی ہے کہ:۔ ”ان کی شاعری کتابی شاعری نہیں ہے، بلکہ زندگی کی آواز ہے، ایک چوٹ کھائے ہوئے گھر سوچنے والے دل کی پکار ہے اور ایک ایسے شاعر کا کلام ہے جسے شعر کہنا آتا ہے۔“ آزاد کی شاعری کے متعلق اب سے چار سال قبل جو رائے ہم ظاہر کر چکے ہیں، وہ دوسرے اڈیشن کے نئے منظومات کو دیکھ کر اور زیادہ پختہ ہو گئی ہے۔ آزاد کی شاعری کا ایک مخصوص زاویہ فکر ہے، لیکن یہ ایسا زاویہ منفرد (Unique angle) ہے جہاں سے ساری کائنات کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے اور اسی لئے ہمیں آزاد کی شاعری میں اس وسعت کے نشانات ملتے ہیں جس میں ایک انسان پھیل کر خود ایک کائنات بن سکتا ہے۔ آزاد کا کلام حکمت و فلسفہ نہیں ہے بلکہ کیسے جذباتی و انعطافی ہے جس میں دل شکستگی و یاس کی جگہ رجائی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں ہم کو درد کے ساتھ درد مندانہ کیفیت بھی ملتی ہے اور ”روئے کشادہ و پیشانی فراخ“ کے ساتھ مصائب کا مقابلہ کرنے کی تلقین بھی۔ اسی لئے ان کے لب و لہجہ میں بڑا ٹھہیراؤ ہے اور ان کے خیالات میں ”متصوفانہ برداشت“ کا انداز۔

فنی حیثیت سے اس دور کے شعراء میں شاید آزاد ہی ایک ایسے شاعر ہیں جن کا کلام اس مقام سے بڑی حد تک پاک ہے اور یہ غالباً نتیجہ ہے اس ابتدائی تعلیم کا جو انھوں نے اپنے والد ”تلوک چند محروم“ کے زیر اثر پائی تھی۔ اس مجموعہ میں ان کی وہ معرکہ آرا طویل نظم بھی شامل ہے جو اردو کی حمایت میں انھوں نے مجلس دہلی کی پہلی سالگرہ کی تقریب میں (۱۹۵۱ء) پڑھی تھی۔ قیمت مجلد للہجہ۔ ضخامت ۳۵۲ صفحات۔

جمال الدین افغانی ضیاء الدین احمد برنی کی تصنیف ہے جس کا یہ دوسرا اڈیشن ”تعلیمی مرکز“ کراچی سے شائع ہوا ہے۔ پہلا اڈیشن ۱۹۶۲ء میں جامعہ ملیہ دہلی نے شائع کیا تھا، لیکن وہ اتنا زیادہ مکمل نہ تھا۔ موجودہ اڈیشن میں انھوں نے کافی اضافہ کیا ہے اور متعدد تصاویر دیکر اسے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔

یہ کتاب تذکرہ ہے جمال الدین کا جو ایک بین الاقوامی شہرت رکھنے والے لیڈر تھے اور جنھوں نے مشرقی ممالک اور خصوصیت کے ساتھ ایران کی بیداری میں نمایاں حصہ لیا۔

جمال الدین کا مشن صرف یہ تھا کہ وہ اسلامی ممالک کو مغربی گرفت سے آزاد کرائے اور اسی کوشش میں اس نے اپنی ساری عمر صرف کر دی۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ پاکستان کے موجودہ ارباب حکومت جو امریکہ کے ہاتھ اپنے ملک کو فروخت کر چکے ہیں، اس کتاب کو کس نگاہ سے دیکھیں گے، لیکن وہاں کے عوام کی وہ جماعت جو پاکستان کی موجودہ پالیسی سے متفق نہیں ہے، یقیناً اس کتاب کی قدر کرے گی۔

یہ کتاب "ٹائپ" میں بہت صاف ستھرے طریقہ سے شایع کی گئی ہے۔

قیمت ہے۔ - ۱۔ لکھنے کا پتہ: ۱۔ تعلیمی مرکز - ۵۰۱، گدوہلی لیکھراج روڈ - نزد مولیدینا مسافر خانہ کراچی۔

مجموعہ ہے سر شکر لال شکر مرحوم رئیس دہلی کی غزلوں کا جسے نہایت اہتمام کے ساتھ سآخر ہوشیار پوری نے

دیپ و حرم

محبوبہ لطیف دہلی سے مجلد شایع کیا ہے۔ ضخامت ۳۲۸ صفحات قیمت درج نہیں ہے۔

شکر لال صاحب دہلی کے مشہور رئیس تھے اور شعر و شاعری سے بڑا شغف رکھتے تھے۔ وہ خود بھی اچھے شاعر تھے اور شاعروں کے بڑے قدر شناس۔ جب تک وہ زندہ رہے، دہلی کی محافل مشاعرہ کے روح رواں رہے اور اردو کی خدمت بڑی درپردہ سے کرتے رہے۔

مجموعہ میں حضرت مانی جابسی کا ایک مقدمہ، جگن ناتھ آزاد کا ابتدائیہ، جوش کا تعارف، کنور مہندر شکر بیدی کا پیش لفظ اور سآخر ہوشیار پوری کا "حرفے چند" شامل ہیں۔ جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم واقعی بڑی خوبیوں کے انسان تھے اور شعراء داد بار کی قدر افزائیوں میں بڑا اعلیٰ حصہ لیتے تھے۔

لطف زبان، ہنسائی، اور معنویت کے لحاظ سے ان کی غزلوں میں تمام وہی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو داغ کے زمانہ میں پائی جاتی تھیں، لیکن کبھی کبھی وہ مومن و مہر کی سرزمین بھی پہنچ جاتے تھے، اور خوب کہتے تھے۔

جوش نے بھی جو غزل گوئی کے شدید مخالف ہیں، مرحوم کی غزلوں کو بڑے پر جوش الفاظ میں سراہا ہے، جسے دیکھ کر جلیل کا یہ شعر بے ساختہ یاد آ جاتا ہے:-

اب اس کو پردہ درسی سمجھو یا کچھ اور کہو

تمہارے حسن کا چرچا ضرور میں نے کیا

اور ہو سکتا ہے کہ جوش کی اس تعریف میں پردہ درسی بھی موجود ہے "کچھ اور کہو" ذیل کے بعض اشعار سے مرحوم کے رنگ و نثر کی پاکیزگی کا اندازہ ہو سکتا ہے:-

سن کر نہاں رشک سے وہ مسکرا دئے	شاید یہ داستان ابھی ناتمام ہے
کسی نظر میں تمہیں دیکھنے کی تاب نہیں	خطاب رنج بھی آٹ دہ تو بے نقاب نہیں
اٹھنے لگیں زمانہ کی نظریں مری طرف	میں نے یہ کس کا نام لیا اضطراب میں
دل پر جو جو تم نے ہاتھ رکھا آگیا قرار	"ٹرپے جو پھر مرا دل مضطرب تو کیا کمروں
ہر ایک قدم پر گلشن میں تھیں رنگ فسانے پھرے ہیں	اے ذوق نظر کچھ تو ہی بتا اب دبیت کا عنوان کیا ہوگا
غصہ میں مان لیتا تھا اکثر بہاری بات	چھٹرا ہزار ہم نے وہ برہم نہ ہو سکا
چل دی قفس میں اور ہر اکبر کے زخم دل	دلت سے فصل گل کا ہمیں انتظار تھا

مجموعہ ہے جناب سر سید صبر پر شاد نگم ناشاد کا پنہوری کی غزلوں کا جسے حال ہوا میں ان کے ایک عزیز

کیف سردی

دیپ پر شاد نگم نے لکھنؤ سے شایع کیا ہے۔

جناب ناشاد ایک نہایت معزز کا بیٹہ گھرانے کے فرزند ہیں اور اس وقت یو۔ پی۔ میں ڈپٹی کلکٹری کی خدمات

انجام دے رہے ہیں۔

جناب ناشاد، حضرت بگڑ بریلوی کے شاگرد ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ کلام بہت منجا ہوا، صاف ہے اور آواز دو ٹوکلف سے پاک۔ اسی کے ساتھ جا بجا انداز بیان کی ندرت کے بھی اچھے نمونے نظر آتے ہیں اور جذباتی حیثیت سے کافی بلند ہیں۔

ناشاد کا کلام روایتی دور غزل کی بڑی اچھی یادگار ہے اور وہی تمام تیور اپنے اندر رکھتا ہے جو کسی وقت شعر کی جان سمجھے جاتے تھے اور شاید آئندہ بھی اسے یہی حیثیت حاصل رہے۔

ابتداء میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر ضیاء احمد ضیاء اور حضرت جگر بریلوی نے مختلف انداز سے ان کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جس سے ناشاد کی غزل کوئی پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں:-

ترک محبت کر دیں لیکن اس پر بھی جب وہ یاد آئیں
تذکرہ تھا گردشیں ایام کا آپ گیوں تیور بدل کر رہ گئے
دل کو کچھ ان سے اور ہی نسبت پر ہم نشین کچھ فکر کہوں کہ ربط محبت ہے ہم نشین
بھلائے اس کو مدت ہو گئی ہے مگر ہر بات پر وہ یاد آیا

یہ مجموعہ دور وہیہ میں دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

مجموعہ ہے جناب افسر میرٹھی کی غزلوں اور نظموں کا جسے انوار چک ڈپو امین آباد لکھنؤ نے مجلد شایع کیا ہے **جوتے روال** ضخامت ۲۲۸ صفحات - قیمت ۱۰

اس مجموعہ کا بڑا حصہ نظموں پر مشتمل ہے جو اخلاقی، تاریخی، موسمی، اور الہیاتی رنگ کی ہیں۔ خالص ادبیاتی یا حسن و عشق کی جذباتی نظم ان میں کوئی نہیں ہے۔ نظموں کے بعد ۳۰ غزلیں نظر آتی ہیں اور پھر چند قطعات و رباعیات۔

افسر صاحب بڑے کہنے مشق شاعر و ادیب ہیں، لیکن چونکہ ان کی عمر کا بڑا حصہ محکمہ تعلیم کی ملازمت اور دوسری کتابوں کی تصنیف میں بسر ہوا ہے، اس لئے محض شاعر بن کر جینے کی فرصت انھیں نہیں ملی، ورنہ شاید اس وقت تک ان کے متعدد کلمات و دواویا شایع ہو چکے ہوتے۔

افسر صاحب بڑی سلجھی ہوئی طبیعت رکھتے ہیں اور اسی لئے وہ جو کچھ سوچتے ہیں اسے بغیر کسی پیچیدگی کے نہایت صاف و سلیس انداز میں ظاہر کرنے کے عادی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک دوسری خصوصیت جسے غالباً ان کی معلمانہ زندگی نے اور زیادہ نکھار دیا، یہ ہے کہ کھلندے پن کی کوئی سطحی بات ان کے ذہن میں نہیں آتی اور اس لئے ان کے ہر شعر میں خواہ غزل کا ہو یا نظم کا کوئی نہ کوئی ناصحانہ و مفکرانہ انداز ضرور پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ انداز نہ مضحکہ نہ ہوتا ہے نہ طنز آمیز، بلکہ اس میں ایک خاص قسم کی رافت و شفقت، نرمی و ملاحظت پائی جاتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان کی شاعری کا یہ رنگ ان کے ہموطن بزرگ اسماعیل میرٹھی کا تصور ہے، جنھوں نے اردو شاعری میں ایک نئی راہ پیدا کی اور یہ واقعہ ہے کہ اس راہ کو افسر صاحب کے سوا کوئی دوسرا صحیح معنی میں اختیار ہی نہ کر سکا۔ افسر میرٹھی اکبر آبادی کا بڑا گہرا اثر پایا جاتا ہے اسی لئے افسر کی زبان بہت شیریں، انداز بیان بڑا سلیس ہے اور ان کے کلام کو پڑھ کر ہم ایسا محسوس کرتے ہیں گویا کسی آہستہ رو چشمہ کے نظارہ سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

چونکہ افسر بہت محتاط سوچنے والوں میں سے ہیں، فنی حیثیت سے بھی انھوں نے بڑی احتیاط سے کام لیا ہے اور ہم مشکل ہی سے کسی جگہ کوئی سقم ان کے کلام میں نکال سکتے ہیں۔

غزل کوئی افسر کا فن نہیں اس لئے مناسب یہ تھا کہ جن نظموں کو انھوں نے غزل کہ کر شایع کرایا ہے انھیں نظمیں ہی رہنے دیتے۔

وجہ الدین وجدی محمد بن عمر ایم۔ اے کا ایک طویل مقالہ ہے دکن کے ایک قدیم شاعر وجدی پر جسے کتابی صورت میں کافی اہتمام کے ساتھ شایع کیا گیا ہے اور دور وہیہ میں کتاب خانہ عابد روڈ حیدر آباد سے مل سکتا ہے۔

وجدی بارہویں صدی ہجری کا مشہور شاعر تھا جس نے ثنویاں بھی لکھیں اور غزلیں بھی۔ اس کی زبان وہی ہے جو دلی دکنی

نے ابتدائی کلام میں استعمال کی ہے اور انداز بیان بھی وہی قدیم شعرا و دکن کا سا ہے۔ وجدی کو مثنوی لکھنے میں خاص ملکہ حاصل تھا اور فاضل مصنف نے زیادہ تر ان کی مثنوی نگاری ہی کو سامنے رکھا ہے۔

تصنیف نہ صرف وجدی بلکہ اس عہد کے عام ذوق شاعری پر بھی ایک بسیط تبصرہ ہے اور پڑھی محنت سے لکھا گیا ہے۔

مجموعہ ہے محمد بن عمر ایم۔ اس کے پانچ ڈراموں کا جو ایک روپیہ میں کتاب خانہ عابد روڈ حیدرآباد سے مل سکتا ہے۔

ایک ایکٹ کے ڈرامے

ان میں سے بعض ڈرامے ریڈیو کے لئے لکھے گئے تھے اور ان سب کا پس منظر موجودہ سماجی مسائل سے تعلق رکھتا ہے جن کے تاریک پہلوؤں کو کہیں کہیں نہایت اچھے طنز سے سامنے لایا گیا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد نہرو کا سب سے بڑا کارنامہ پنج سالہ پلان ہے۔ اس اسکیم میں ملک کی اقتصادیات کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جسے نظر انداز کر دیا گیا ہو، اس اسکیم اتنی بڑی ہے کہ پلاننگ کمیشن کو ایک ہزار

پہلا پنج سالہ پلان

صفحات پر پھیلا کر اسے حکومت کے سامنے پیش کرنا پڑا۔ اور اب اردو میں اسی چیز کو کتابی صورت میں اختصار کے ساتھ شائع کیا گیا ہے، جس میں متعدد تصویروں، نقشوں اور گوشواروں وغیرہ سے اس اسکیم کی تمام جزئیات کو سمجھایا گیا ہے۔ اس اسکیم میں زراعت، فلاح، آبپاشی، صنعت و حرفت، رہاؤ عام، تعلیم، نسل کشی، معدنیات، گھریلو صنعتیں اور سماجی اصلاح، الغرض قومی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کی آئندہ اصلاح و ترقی سے بحث نہ کی گئی ہو۔

ہندوستان کی قومی آمدنی ۱۹۵۰ء میں ۹۰ ارب (نو ہزار کروڑ) تھی، لیکن پنج سالہ پلان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۵۵ء تک یہ ۱۰۰ ارب روپیہ تک پہنچ جائے گی اور اس کا بڑا حصہ عوام کے معیار زندگی کو بہتر کرنے کے کام میں آجائے گا۔ جس کی تفصیل اس کتاب میں درج کی گئی ہے۔

وہ حضرات جو اقتصادیات سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس رپورٹ کا مطالعہ اہم ضروری ہے اور یوں بھی ہر وہ شخص جو ہندوستان کی آئندہ ترقی کا خواہاں ہے اسے اس کا مطالعہ افادہ سے خالی نہیں۔

ایک کتابچہ ہے انگریزی میں جسے حکومت ہند کے شعبہ نشر و اشاعت نے ریڈیو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے شائع کیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت ہندوستان

Good Listening

میں کتنے ریڈیو اسٹیشن کن کن میٹر پر کام کر رہے ہیں اور ان کی نشریات سے مستفید ہونے کے لئے کن امور کا لحاظ رکھنا مناسب ہے۔ اس میں ریڈیو سیٹ استعمال کرنے اور ریڈیو پروگرام سننے کی بھی خاص خاص ہدایات درج ہیں، جن سے مقصود پبلک میں خاص ریڈیائی تہذیب و سلیقہ پیدا کرنا ہے۔

اس میں جو اعداد و شمار دئے گئے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں ریڈیو کا ذوق کتنا عام ہوتا جا رہا ہے اور حکومت اس کو مستفید بنانے کے لئے کس قدر کوشش کر رہی ہے۔ اس کی قیمت ۲ روپے لیکن شاید ریڈیو سیٹ خریدنے والوں کو مفت بھی دیا جاتا ہے۔

دیکھئے

سالنامہ ۱۹۵۵ء کے لئے چھ آنے کے ٹکٹ بھیجنا نہ بھول جائیے۔ ورنہ ہم اس کے محفوظ پہونچنے کے ذمہ دار نہ ہوں گے اور اس کے گم ہو جانے کی صورت میں دوبارہ ہم اسے مفت فراہم نہ کر سکیں گے۔ منیجر

مکتوباتِ نیاز

(بین حصوں میں)

اڈیشہ نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، نگینی اور انیسٹیل پن کے لحاظ سے فن، انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان ایڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر طاعت ہوئی ہے۔ قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عظیم النظر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ شہر نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشائیہ عالیہ بحر حلال کے درجہ تک پہنچی ہے۔ یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جذباتِ بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہتے بہتے ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے، اردو میں بھی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔ قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے غنفوان شہاب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشائیہ کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی تازہ ایڈیشن نہایت صحیح و خوش خط قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فلاسفہ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں۔ (۱) چند گھنٹے فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔ (۲) ماؤمین کا مذہب۔ نہایت مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فرست الید

مؤلفہ نیاز فتحپوری۔ اس کے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی خست اور اس کی لگیروں کو دیکھ کر اپنے یاد دہرے شخص کے مستقبل، سیر، رنج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

نقابِ اٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے بادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ مسم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشائیہ کے لحاظ سے جو مرتب ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے نکل رہتا ہے قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکراتِ نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ جدید ایڈیشن ہے جس میں صحت و نقاست کا غزو و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فرست مضامین یہ ہے ایران و ہندوستان کا ترجمان شاعری پر ذہنی زبان کی پیش پر امور خانہ نظر اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ اردو غزل گوئی کی حمد و برہمداری نقشبندی کے گنگوہی کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ ادبیات اور اصول نقد فنون ویرہ حقیقت نگاری قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکہ آرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیوں کر رائج ہوا اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۶۲ء

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مومن کے مطالعہ کے لئے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۶۳ء

اس نمبر میں ریاض خیر آبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری، مارچ ۱۹۶۳ء

جو فن و نقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۶۴ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جو پہلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اہل علم کی عظمت و اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۶۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے باسانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیئے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں "مارسی ہندس" کی مشہور عالم کتاب ایک مستقبل کی تلاش کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس سائیران، مصر، عراق و فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد ہاں کی موجود اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہو اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ ڈیڑھ نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۲ء

(حسرت نمبر)

جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی، حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لئے اس کا مطالعہ از اس ضروری ہے۔

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۳ء

(دماغ نمبر) جس میں دماغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کئے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے، اس نمبر میں قیام، ہجو، قیام حیدر آباد کے زمانہ کے علاوہ ان کی حیات عذوبہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے فن شعر کوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ قیمت دو روپیہ

سالنامہ ۱۹۵۴ء

(فرزانہ و یان اسلام نمبر) یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لے کر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دیے گئے ہیں ان کے اسباب عروج و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ درمہل ایک تاریخی کتاب ہے جو ہر کھٹے پٹے کے پاس ہونا چاہیئے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

اگر ۵۱ تک کسی ماہ کا پرچہ

آپ کو نہ ملے

تو اطلاع ملنے پر آئندہ ماہ کے پرچہ کے ساتھ ہم اپنے صرف سے فراہم کر دیں گے، لیکن اگر آپ اس سے قبل چاہیں گے تو یہ نکتہ وائے ہوگا کہ کیونکہ مینز کے اندر راندر پیٹھ پیچھے میں ہم کو اپنا محصول اور کرنا ہوگا اس لئے جب آپ پرچہ نہ پہنچنے کی اطلاع دیں تو یہ ضرور لکھ دیجئے کہ آپ فوراً چاہتے ہیں یا اگلے پرچہ کے ساتھ۔ نمبر نگار